For more books visit www.4Urdu.com
A-PDF Watermark DEMO: Purchase from www.A-PDF.com to remove the watermark

پور عنایت خاں کی موسیقی پر خاص طور سے عاشق تھے اور اس فن میں انہیں اپنا گرو تسلیم کرتے تھے۔

اسی دوران میں عنایت خاں حیدر آباد دکن پہنچے اور میر محبوب علی خاں کے دربار میں باریاب ہوئے۔ نظام تصوف اور موسیقی کے دلدادہ تھے اور رفتہ رفتہ دونوں میں خوب گاڑھی چھننے لگی۔ دربار عام کے علاوہ عنایت خاں کو نظام کی خاص مجلسوں اور نجی محفلوں میں بھی عمل دخل حاصل تھا۔ میر محبوب علی کے اصرار پر عنایت خاں اس بات پر رضا مند ہو گئے کہ وہ حیدرآباد میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لیں۔ لیکن کارکنان قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

حیدر آباد میں عنایت خاں کی ملاقات چشتیہ سلسلہ کے ایک بزرگ سید محمد ابو ہاشم مدنی سے ہوئی۔ سید صاحب نے عنایت خاں کو راہ سلوک کے پیچ و خم سے آشنا کیا۔ اس راستہ میں مجاہدے کے ریگزار بھی تھے' اور مشاہدے کے گل و گلزار بھی۔ سفر کی دشوار گزار گھاٹیاں بھی تھیں اور منزل مقصود کے پراسرار سنگ میل بھی' عنایت خاں نے سید ابوہاشم مدنی کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور مرشد کی رہنمائی میں وہ اپنے گلے کا نور برساتے' وینا بجاتے' اس نئے راستے پر چلتے گئے' چلتے گئے' حتیٰ کہ ان کے اپنے الفاظ میں "ایک ایسی منزل آ گئی جہاں پر میرا جسم وینا کا ساز بن گیا۔ میری روح وینا کے تار بن گئی اور میری زندگی ایک سرمدی راگ بن گئی۔ اس مقام پر پہنچ کر میں نے اپنے فن کا سارا اثاثہ اس ازلی اور ابدی موسیقار کے سپرد کر دیا جو کائنات کے سرگم پر ہر لحہ آفاقی تانیں اڑانے میں مصروف ہے۔"

جب عنایت خاں کی موسیقی میں معرفت کا رنگ اچھی طرح رچ گیا' تو ان کے مرشد سید ابوہاشم مدنی نے حکم دیا کہ اب وہ مغربی ممالک میں چلے جائیں' اور اپنے فن کے ذریعہ روحانیت کا پیغام لوگوں تک پہنچائیں۔

عنایت خاں نے مرشد کے حکم پر سر تسلیم خم کیا اور ۱۳ ستمبر ۱۹۱۰ء کو امریکہ روانہ

For more books visit www.4Urdu.com

ہو گئے۔ ان کے ایک حقیقی اور ایک چچا زاد بھائی بھی ساتھ تھے۔ اس وقت ان تینوں کی عمر تیس تیس سال سے بھی کم تھی۔

URDU4U.COM

نیویارک پہنچ کر عنایت خاں نے اپنا پہلا لیکچر کولمبیا یونیورسٹی میں دیا۔ اس کے بعد وہ بہت سے دوسرے شہروں اور اداروں میں اپنی محفلیں منعقد کرتے رہے۔ ان کے مداحوں میں سانتا روازا کے فن باغبانی کے ماہر لوتھر بونبیک بھی شامل تھے۔ وہ تھوہر کے پودے کو کانٹوں کے بغیر پیدا کرنے کا تجربہ کر رہے تھے۔ بے خار حیات عنایت خاں کا نصب العین تھا' اور بے خار نباتات لوتھر بونبیک کا۔ یہی ان کی دوستی کی قدر مشترک بن گئی۔

امریکہ میں دو برس گزارنے کے بعد عنایت خاں اپنے بھائیوں سمیت انگلستان آ گئے یہاں سے وہ روس گئے۔ ماسکو میں ٹالسٹائی کا بیٹا کاؤنٹ سرجے ٹالسٹائی عنایت خاں کا مداح بن گیا۔ اس نے انہیں بہت سے روسی موسیقاروں سے متعارف کرایا اور ماسکو کے علاوہ دوسرے کئی شہروں میں ان کے فنی شو منعقد کرانے میں مدد دی۔ کاؤنٹ ٹالسٹائی ہی کی کوشش سے عنایت خاں کی کتاب (A Sufi Message of Spiritual Liberty) کا روسی زبان میں ترجمہ ہو کر ماسکو میں شائع ہوا۔

ایک روایت کے مطابق صوفی عنایت خاں کے ملاقات زار روس سے بھی ہوئی تھی۔ اس ملاقات کا بندوبست راسپوتین نے انتہائی خفیہ طور پر کرایا تھا۔ ملاقات کے دوران راسپوتین کے علاوہ اور کوئی شخص وہاں پر موجود نہ تھا۔ اس ملاقات کی پوری تفصیلات دستیاب نہیں ہو سکیں۔

ماسکو میں عنایت خاں کا ایک مداح بے بیگ تھا۔ بے بیگ تاتاریوں کا سردار تھا اور امیر بخارا کی جانب سے زار روس کے دربار میں سفیر کے عہدے پر مامور تھا۔ بے بیگ نے بہت کوشش کی کہ عنایت خاں بخارا کا دورہ بھی کریں' لیکن انہی دنوں پہلی جنگ عظیم سر پر آ گئی اور عنایت خاں انگلستان واپس لوٹ آئے۔

جنگ کے پانچ سال عنایت خاں نے انگلستان میں بسر کئے۔ اس عرصہ میں انہوں نے "صوفی

For more books visit www.4Urdu.com

تحریک" کی منظم طور پر بنیاد ڈالی اور لندن میں ایک اشاعتی ادارہ "صوفی پبلشنگ سوسائٹی" کے نام سے قائم کیا۔

جنگ کے بعد انہوں نے یورپ کے چپے چپے کا دورہ کیا۔ ہر جگہ مریدوں کی خاصی تعداد ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے صوفی تنظیم میں داخل ہونے لگی۔ اب وہ موسیقار عنایت خاں کی جگہ مرشد عنایت خاں کہلانے لگے اور چار پانچ سال کے اندر اندر یورپ کے بہت سے ملکوں میں صوفی تحریک کے سنٹر قائم ہو گئے۔ خاص طور پر ہالینڈ' سوئٹزر لینڈ' فرانس' جرمنی' اٹلی' آسٹریا' سویڈن' ناروے' ڈنمارک اور انگلستان کے بہت سے شہروں میں ان کی شاخیں بڑی سرگرمی سے چلنے لگیں۔ امریکہ اور جنوبی افریقہ میں بھی اس کے کئی سنٹر قائم ہو گئے۔

اپنی تحریک کو اس طرح دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتے دیکھ کر عنایت خاں نے جنیوا میں اپنی تحریک کا بین الاقوامی مرکز (Headquarters of the Sufi Movement The Internaional) کے نام سے قائم کر دیا۔ اس کی ایک برانچ پیرس میں کھولی جہاں اب انہوں نے اپنا مستقل قیام اختیار کر لیا تھا۔ یہاں پر ان کی رہائش گاہ کا نام "فضل منزل" تھا۔ بین الاقوامی ہیڈ کوارٹر کی دوسری برانچ ہیگ کے قریب (Katwijk) کے مقام پر تھی۔ اس کا نام "مراد حاصل" تھا۔ یہاں پر اب "مراد حاصل فاؤنڈیشن" قائم ہے۔

۱۹۲۶ء میں عنایت خاں کو ہندوستان چھوڑے سولہ برس ہو چکے تھے۔ یورپ میں ان کی صوفی تحریک اپنے نکتہ عروج پر تھی کہ یکایک ان کے دل میں خاک وطن کی کشش نے زور مارا' اور نومبر کے مہینے میں وہ ہندوستان روانہ ہو گئے۔ ان کی یورپین سیکرٹری قسمت شام ان کے ہمراہ تھی۔ پیرس میں ان کے حلقہ بگوشوں کی کثیر تعداد نے ان کو الوادع کہا اور دوسرے شہروں میں ان کے بہت سے اور مرید اپنے مرشد کی واپسی کے انتظار میں بیٹھ گئے۔

For more books visit www.4Urdu.com

ہندوستان پہنچ کر صوفی عنایت خاں نے دلی اور لکھنؤ کی یونیورسٹیوں میں لیکچر دیئے اور بنارس' آگرہ' جے پور اور بڑودہ کا دورہ بھی کیا۔ انہوں نے لوگوں کو مغرب میں اپنے مشن کی کامیابیوں سے آگاہ کیا' لیکن یہاں پر ان کے مسلک کو کسی قسم کی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ یہاں پر ان کو فقط ایک یا دو مرید نصیب ہوتے۔ ان میں سے ایک مسز شاستری تھی جو ایک ہندو ڈاکٹر کی امریکن بیوی تھی۔ اپنی اس ناکامی سے مایوس ہو کر انہوں نے یورپ واپس جانے کا پروگرام بنا لیا۔ روانہ ہونے سے پہلے وہ اجمیر شریف گئے۔ دسمبر کی سردی کے ایام تھے۔ صوفی عنایت خاں کئی رات متواتر محفل سماع میں شریک ہوتے رہے۔ اس کڑاکے کی سردی میں ساری ساری رات ٹھنڈے ٹھنڈے فرش پر بیٹھنے کی وجہ سے انہیں نمونیہ ہو گیا۔ دلی واپس آ کر وہ کئی ڈاکٹروں کے زیر علاج رہے۔ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خان نے بھی ان کے علاج معالجہ میں حصہ لیا۔ ۴ فروری ۱۹۲۷ء کی رات کو صوفی عنایت خاں بے ہوش ہو گئے۔ مس قسمت سٹام جو ان کے ساتھ یورپ سے آئی تھی۔ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی کہ اس کا مرشد قریب المرگ ہے وہ یہی سمجھتی رہی کہ مرشد مراقبہ میں غرق ہو کر سمادھی میں گیا ہوا ہے۔ وہ کئی گھنٹے مرشد کی چارپائی کے ساتھ گھٹنے ٹیک کر زمین پر بیٹھی رہی۔ صبح کے آٹھ بج کر بیس منٹ پر دو ڈاکٹروں اور مسز شاستری نے بڑی مشکل سے اسے یقین دلایا۔ مرشد اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ صوفی عنایت خاں کو خواجہ نظام الدین کی درگاہ کے قریب دفن کر دیا گیا۔

صوفی عنایت خاں کی وفات کے بعد ان کے سلسلہ کو ان کے بھائیوں محبوب خاں محمد علی خاں اور مشرف خاں نے چلایا۔ عنایت خاں کی بیوی ایک امریکن خاتون امینہ بیگم تھیں۔ ان کے بطن سے کئی بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں' لیکن صوفی تحریک کی جانشینی ان میں سے کسی نے نہ سنبھالی۔ ان کی ایک بیٹی نے البتہ ایک دوسرے میدان میں بڑا نام پیدا کیا اس کا نام نور النساء عنایت خاں عرف "بابلی" تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں جب

For more books visit www.4Urdu.com

جرمن افواج نے فرانس پر قبضہ کیا' تو نورالنساء پیرس میں مقیم تھی۔ اس نے "میڈیلین" کا کوڈ نام اختیار کر کے لندن میں اتحادی فوجوں کے ہیڈکوارٹر کو خفیہ پیغامات بھیجنے کا فریضہ سنبھال لیا۔ اس مقصد کے لیے وہ ایک وائرلیس سیٹ استعمال کرتی تھی۔ یہ کام اس نے بڑی جانفشانی اور دلیری سے سر انجام دیا۔ جنگ کے دوران ایک ایسا وقت بھی آیا جب لندن میں اتحادی ملٹری ہیڈکوارٹر کا فرانس کے ساتھ واحد رابطہ نورالنساء عنایت خاں عرف "میڈیلین" کی ذات کے ذریعہ قائم تھا۔ لیکن پھر کسی نے دغا دے کر اس کا راز فاش کر دیا اور جرمن فوجیوں نے اسے گرفتار کر کے گولی سے اڑا دیا' ہٹلر کی شکست کے بعد جب جنرل ڈیگال نے فرانس کی حکومت سنبھالی' تو نورالنساء عنایت خان کو بعد از موت فرانس اور برطانیہ نے بہادری کے نہایت اعلیٰ اعزازات سے نوازا۔ ان اعزازات کی نقول اس باب کے آخر میں منسلک ہیں۔

عنایت خان کے مرشد سید محمد ابوہاشم مدنی نے انہیں اسلامی تصوف کے رموز سے آشنا کیا تھا اور رشد و ہدایت کے اسی طریق کو مغربی ممالک میں پھیلانے کی تلقین کی تھی' لیکن امریکہ اور یورپ پہنچ کر انہوں نے وہاں کے ماحول کے ساتھ سمجھوتا کر لیا۔ وہاں کے لوگوں کو اس سلسلہ میں داخل کرنے کی بجائے انہوں نے اپنے سلسلہ کو ہی مغربی مزاج کے سانچے میں ڈھال لیا۔ چنانچہ اسلام کی تبلیغ کرنے کی بجائے ان کا مسلک تھیوسوفیکل سوسائٹی کی طرز پر مختلف مذاہب کا ایک مجموعہ اخلاقیات سا بن کر رہ گیا۔ اس مسلک میں اسلام سمیت دنیا کے سب مذاہب یکساں درجہ رکھتے ہیں۔ کسی ایک مذہب کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں۔ اسی طرح "صوفی" یا "مرید" بننے کے لیے بھی کسی خاص مذہبی عقیدے کی ضرورت نہیں مسلمانوں' عیسائیوں' یہودیوں اور زرتشتیوں کے علاوہ ہندو' بت پرست' مشرک اور ملحد بھی یکساں طور پر اس سلسلہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس مسلک میں کتاب فطرت انسان کا واحد مقدس صحیفہ ہے اور عالمگیر انسان کا واحد مشترکہ مذہب ہے۔ عبادت کو بین الاقوامی اتحاد کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں اور اس مقصد کے لیے اس تحریک میں "عالمگیر عبادت" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

For more books visit www.4Urdu.com

"عالمگیر عبادت" میں حصہ لینے والے ایک بند کمرے میں قطار در قطار بیٹھ جاتے ہیں۔ سامنے ایک کشادہ میز کے عین وسط میں ایک بڑی موم بتی روشن کی جاتی ہے جو علامتی طور پر خدائے واحد کا نشان ہوتی ہے جو ساری روشنی اور علم کا منبع و ماویٰ ہے۔ اس موم بتی سے نیچے کی سطح پر چھ چھوٹی موم بتیوں کی قطار ہوتی ہے جو علی الترتیب ہندو مت' بدھ مت' زرتشتیت' یہودیت' مسیحت اور اسلام کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ہر موم بتی کے سامنے اس مذہب کا صحیفہ بھی رکھا ہوتا ہے۔ عالمگیر عبادت کے اس مجمع کو (Church For All) کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

اس قسم کی اجتماعی عبادت کے علاوہ مریدوں کا مرشد کے ساتھ اپنا اپنا ذاتی رشتہ بھی قائم ہوتا ہے جس میں انہیں الگ الگ ذکر و اذکار کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ تعلیم صیغہ راز میں رکھی جاتی ہے جر مرید ترقی کرتے جاتے ہیں' ان کو حسب مراتب حاجزادی' نور زادی' شہزادہ شہزادی' سراج' چراغ وغیرہ کے خطاب دیئے جاتے ہیں' خاص خاص اجازت یافتہ مرید وقتہ وقتہ ذکر کا حلقہ بھی قائم کرتے ہیں۔ یہ حلقے بھی انتہائی خفیہ طور پر قائم کئے جاتے ہیں۔

اس تحریک کا اسلام اور اسلامی تصوف کے ساتھ صرف اتنا تعلق ہے کہ اس میں بہت سی عربی اور فارسی کی اصطلاحات بڑی روانی سے استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً ذکر' اسم اعظم' پیر و مرشد' شیخ المشائخ' بیعت' مراد حاصل' دربار' ہجرت' ولادت' وصالت' تبروک' رحمت' فضل وغیرہ۔ اس ظاہری تعلق کے علاوہ اس تحریک کا اسلام اور اسلامی تصوف کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں' اسلام میں طریقت کے لیے لازم ہے کہ وہ شریعت کی پابند ہو اس لحاظ سے عنایت خاں کے مشن کو تصوف کا نام دینا ہی اس اصطلاح کا غلط استعمال ہے۔

ہالینڈ میں اس تحریک کے آخری مسلمان سربراہ صوفی عنایت خاں کے چھوٹے بھائی مشرف مولا میاں خاں تھے۔ ۱۹۶۳ء میں جب میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے ہیگ میں متعین تھا' تو مشرف خاں صاحب سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں' ان کی بیگم ایک ڈچ

For more books visit www.4Urdu.com

خاتون تھیں' جن کو صوفی تحریک کی طرف سے "شہزادی" کا خطاب ملا ہوا تھا۔ وہ اپنے میاں سے زیادہ تعلیم یافتہ تھیں اور ان کی زندگی میں ہی تحریک پر اپنا تسلط جما رہی تھیں۔

URDU4U.COM

ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک روز صوفی مشرف خاں نے بڑے دکھ سے کہا کہ ان کی وفات کے بعد یہ تحریک مکمل طور پر یورپین لوگوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی اور پھر رفتہ رفتہ اسلام کے ساتھ اس کا جو تھوڑا بہت اصطلاحی سا رابطہ ہے' وہ بھی ختم ہونا شروع ہو جائے گا۔ صوفی مشرف خاں کی وفات کو چند برس گزر چکے ہیں اور جس خدشہ کا انہوں نے اظہار کیا تھا وہ بھی آہستہ آہستہ اپنا رنگ لا رہا ہے۔

صوفی مشرف مولا میاں خاں بڑے سادہ طبیعت مرنجاں مرنج انسان تھے۔ ڈچ زبان روانی سے بولتے تھے۔ کسی قدر انگریزی سے بھی شناسا تھے۔ اردو بول تو لیتے تھے' لیکن پڑھنے میں دقت پیش آتی تھی۔ ایک روز میں ان کے ہاں بیٹھا تھا' تو انہوں نے کچھ "عارفانہ" کلام سنانے کی پیش کش کی۔ پیانو پر پہلے انہوں نے غالب کی اس غزل کے کچھ اشعار گائے:

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اس کے بعد انہوں نے اقبال کی یہ غزل سنائی:

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

اس غزل کا ایک شعر ہے:

For more books visit www.4Urdu.com

کھنچے خود بخود جانب طور موسیٰ
کشش تیری اے شوق دیدار کیا تھی

URDU4U.COM

اس شعر کو گاتے وقت وہ "موسیٰ" کو لگاتار "موسی" ہی پڑھتے گئے۔ ان دو غزلوں کو وہ "عارفانہ کلام" غالباً اس وجہ سے سمجھتے تھے کہ ایک میں ابن مریم اور دوسرے میں موسیٰ کا نام آتا تھا۔

ڈچ مرید صوفی مشرف خاں کو "حضرت پیر و مرشد" کے القاب سے مخاطب کرتے تھے وہ خود بھی اپنے آپ کو مرشد مشرف خاں کے نام سے متعارف کراتے تھے۔ ایک بار انہوں نے اپنی تصنیف (Pages in the Life of a Sufi) مجھے تحفتہ" دی۔ اسے انہوں نے ایک انگریز خاتون مس مارگرٹ سکنر کے تعاون سے لکھا تھا۔ میری درخواست پر انہوں نے اس پر انگریزی میں جو آٹو گراف دیا وہ یہ تھا: (Murshid Musharaff Khan)

ان کے مریدوں میں ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں میں وہ خاص طور پر ہر دلعزیز تھے۔ غالباً اسکی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ کسی مرید سے کسی بات پر کسی قسم کا اختلاف رائے نہ کرتے تھے! ان کا سر ہمیشہ اثبات میں ہلتا تھا۔ میں نے کبھی ان کا سر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں جانب ہلتے نہیں دیکھا!

ان سب باتوں کے باوجود ہالینڈ کے وزیرخزانہ پروفیسر Wiueyeen پر ان کا بڑا اثر تھا اور وہ بہت سے ذاتی اور سیاسی معاملات میں استخارہ کروانے صوفی مشرف خاں کے پاس آیا کرتے تھے۔

ہٹلر کی شکست کے بعد فرانس کے صدر جنرل ڈیگال نے نورالنساء عنایت خاں کو بہادری کا ایک بہت بڑا اعزاز بعد ازموت عطا کیا۔ اس اعزاز کا نام یہ تھا:

(The Croix de Guerre with Gold Star)

اسی طرح برطانیہ کے بادشاہ نے بھی اسے بعد از موت "جارج کراس" کے بیش بہا سے نوازا۔

For more books visit www.4Urdu.com

• تو ابھی راہگذر میں ہے

جون کا مہینہ ختم ہوتے ہی انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سٹڈیز میں میرا کورس پورا ہو گیا۔ وطن کو واپس لوٹنے سے پہلے میں نے حج کی نیت کر لی۔ اس سال حج کا دن اگست کے مہینہ میں پڑتا تھا۔

URDU4U.COM

سفر حج کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک روز میں ہیگ میں امریکن ایکسپریس کے دفتر گیا۔ ہالینڈ کے دارالخلافہ میں سفری انتظامات کرنے والے جتنے ادارے تھے' ان میں امریکن ایکسپریس کا نام سب سے زیادہ وسیع اور قابل اعتماد شمار ہوتا تھا۔ یہاں ہر وقت ایسے سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا تھا جو کم سے کم وقت میں لمبے سے لمبا سفر کرنے کے خواہش مند تھے۔ یہ سفر عموماً دنیا کی جانی پہچانی شاہراہوں پر ہوتے تھے اور سیاحتوں کے سنگہائے میل نیویارک' لندن' پیرس' جنیوا' روم' بیروت' قاہرہ' ہانگ کانگ' ٹوکیو' جیسے شہروں میں ہوتے تھے۔ اس قسم کا سفر کتنا ہی طویل اور پیچیدہ کیوں نہ ہو' امریکن ایکسپریس کے بحری' بری' اور ہوائی شعبوں کے ماہر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی پوری تفصیلات تیار کر دیتے تھے------ ریل اور جہاز کے ٹکٹ' چلنے اور ٹھہرنے کے اوقات نامے' ہوٹلوں کے پتے اور کرائے۔ مختلف شہروں میں قابل دید مقامات کی فہرست' رقص گاہوں اور نائٹ کلبوں کے ٹیلی فون نمبر.....

امریکن ایکسپریس کے ہال میں پہنچ کر سب سے پہلے میرا سامنا انکوائری آفس کی ایک لڑکی سے ہوا اس نے خالص ڈچ انداز میں اپنی گردن کو لوچ دے کر امریکن لہجے میں میرا استقبال کیا۔ "گڈمارننگ سر میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"شکریہ۔" میں نے کہا۔ "میں سعودی عرب جانا چاہتا ہوں۔ اس سفر کے متعلق معلومات حاصل کرنے یہاں حاضر ہوا ہوں۔"

"ساعو عودی عیرے بیا..... ساعو عو عودی عیرے بی..... بی..... یا..."

For more books visit www.4Urdu.com

لڑکی نے کئی بار زیر لب گنگنایا اور پھر امریکن انداز میں اپنے شانے سکیڑ کر میری طرف یوں حیرت سے دیکھنے لگی جیسے میں نے اس سے کوئی عجیب و غریب سوال پوچھ لیا ہو۔

URDU4U.COM

کچھ دیر اور گنگنانے اور کندھوں کو نیم بیضوی جنبشیں دینے کے بعد وہ بادل نخواستہ اٹھی اور مجھے اپنے ہوائی شعبے کے ماہر کے پاس لے گئی سعودی عرب کا نام سن کر ہوائی شعبے کے ماہر نے بھی مجھے کن انکھیوں سے گھورا اور پھر نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ مجھے بحری شعبے کے ماہر کے حوالے کر دیا۔ بحری شعبے والے نے مجھے بری شعبے میں بھیج دیا اور بری شعبے کا ماہر کچھ دیر اپنا سر کھجلانے کے بعد مجھے اپنے مینجر کے پاس لے گیا۔

سعودی عرب کا نام سن کر مینجر بھی کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ پہلے اس نے اپنے میز کی دراز سے ایک ضخیم اٹلس نکال کر اس میں مشرق وسطیٰ کے نقشوں کا مطالعہ کیا۔ پھر اٹھ کر وہ سامنے دیوار پر لگے ہوئے چارٹ کا جائزہ لینے لگا' جس میں ساری دنیا کے ہوائی' بحری اور بری راستوں کے مفصل خاکے بنے ہوئے تھے۔ میں نے جدہ' مکہ اور مدینہ پر انگلی رکھ کر مینجر سے کہا کہ اگر میں ان تینوں شہروں میں سے کسی ایک جگہ بھی پہنچ جاؤں تو میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔

مینجر نے اپنی میز سے سرخ جھنڈیوں والے تین پن اٹھا کر ان مقامات پر نشاندہی کے طور پر لگا دیئے۔

دنیا میں مشرق سے مغرب اور شمال اور جنوب تک ہر قسم کے سفری راستوں کے بے شمار جال بچھے ہوئے تھے' لیکن اس زمانے میں یہ شاہراہیں بغداد اور تہران دمشق اور بیروت' قاہرہ اور پورٹ سعید سے ہوتی ہوئیں سیدھی آگے یا پیچھے' دائیں یا بائیں ہو کر نکل جاتی تھیں اور ان کے درمیان حجاز کی مقدس سر زمین الگ تھلگ پڑی رہ جاتی تھی۔ کیونکہ اس وقت تک ابھی سعودی عرب میں دولت دنیا کی ریل پیل شروع نہیں ہوئی تھی' مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے نام مسلمانوں کے دل پر تو بے شک خوب نقش تھے۔

For more books visit www.4Urdu.com

لیکن کسی بین الاقوامی سفری گائیڈ میں ان کا ذکر تک نہ آتا تھا---- حالانکہ ہر سال دنیا کے کونے کونے سے لاکھوں مسلمان قافلہ در قافلہ اس ارض مقدس کا سفر اختیار کرتے رہے ہیں---- پیدل' اونٹوں پر' موٹروں پر' ریلوں پر' کشتیوں میں' ہوائی جہازوں کے ذریعہ..... روئے زمین پر اور کوئی ایسا مقام نہیں جہاں اتنی رنگتوں اور نسلوں اور قومیتوں کے انسان بیک وقت اس قدر تعداد میں جمع ہوتے ہوں۔

"مجھے اپنی لاعلمی پر ندامت ہے۔" امریکن ایکسپریس کے مینجر نے نقشوں کا سرسری سا جائزہ ختم کر کے کہا۔ "لیکن اگر مجھے دو روز کا وقت دیں' تو شاید میں آپ کو اس سفر کے متعلق کوئی مفید مشورہ دے سکوں۔"

دو روز کے بعد جب میں دوبارہ امریکن ایکسپریس کے دفتر میں گیا' تو مینجر کے سامنے بہت سے سفری گائیڈز کا انبار لگا ہوا تھا' لیکن اس ساری کاوش کا عملی نتیجہ فقط اس قدر تھا کہ یورپ کا یہ وسیع اور ماہر سفری ادارہ اس بات میں میری مدد کرنے سے قاصر تھا کہ میں قاہرہ یا بیروت یا بغداد سے جدہ یا مکہ یا مدینہ پہنچنے کے لیے سفر کا کون سا طریقہ اختیار کروں۔

"اس سلسلے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔" مینجر نے معذرتانہ انداز سے کہا۔ "ہاں' حج کے زمانہ میں کئی حکومتیں اپنے اپنے حاجیوں کے لیے ہوائی جہازوں' سمندری جہازوں اور خشکی کے قافلوں کا خاص انتظام کرتی ہیں۔ یہ انتظام ہر جگہ سرکاری طور پر ہوتے ہیں۔ ہمیں ان کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی۔"

برسبیل تذکرہ مینجر نے مجھے ایک اور مشورہ بھی دیا۔ "جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے' میں سمجھتا ہوں کہ اس موسم میں سعودی عرب کا سفر صحت کے لیے خطرات سے خالی نہیں۔ گرمیوں میں وہاں کا درجہ حرارت ۱۲۵ ڈگری سے بھی اوپر پہنچ جاتا ہے۔ یوں بھی اس ملک میں حفظان صحت کا کوئی بندوبست نہیں۔ اگر کسی وجہ سے آپ اپنا ارادہ بدلنے والے ہوں' تو حسن اتفاق سے میرے پاس کیپری کی ایک بکنگ خالی ہے۔ کیپری سے تو آپ ضرور واقف ہوں گے" نیلے نیلے بحیرہ روم کے درمیان وہ خوشنما جزیرہ

For more books visit www.4Urdu.com

جہاں چمکیلی دھوپ ہے۔ خوبصورت سیر گاہیں ہیں۔ اطالیہ کے انگوروں کی بہترین شراب ہے۔ مصر کا سابق شاہ فاروق ہے۔ دراصل کیپری آج کل دنیا بھر کے سیاحوں کا مکہ ہے اگر آپ زندگی کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں' تو میری رائے میں کیپری ضرور جایئے۔"
میں نے مینجر کا شکریہ ادا کیا اور دل ہی دل میں یہ شعر گنگناتا ہوا وہاں سے اٹھ آیا۔

اوروں کو دیں حضور یہ پیغام زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں

اس سفر کے متعلق بیروت' دمشق اور بغداد سے بھی سفارت خانوں' سفری ایجنسیوں اور مقامی دوستوں کی وساطت سے جو خبریں موصول ہوئیں' وہ بڑی مایوس کن تھیں۔ وہاں قاہرہ سے البتہ امید کی ایک مدھم سی کرن ضرور جھلملائی۔ مصر کی انقلابی حکومت نے اعلان کر رکھا تھا کہ حج سے ایک ماہ پہلے ہر تیسرے روز بحری اور ہوائی جہاز مصر سے حجاز جایا کریں گے۔ یہ جہاز مصری حاجیوں کے لیے مخصوص تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان جہازوں میں ایک پاکستانی مسافر کیلئے بھی جگہ نکل سکے گی یا نہیں۔ بہرحال یہ خبر اس لحاظ سے اطمینان بخش تھی کہ آخر ایک راہ تو ایسی نظر آئی جس کے لیے انسان کچھ دوڑ دھوپ کر سکتا ہے۔ باقی سب راہیں یا تو مسدود تھیں یا ان پر لاعلمی کے کہرابے چھائے ہوئے تھے۔
جب میں نے مصر والی خبر اپنے ایک لبنانی دوست مصطفیٰ الخیری کو سنائی تو اس نے مایوسانہ انداز سے سر ہلایا۔ "تم جا کر کوشش کر دیکھو۔ مجھے بالکل امید نہیں کہ تمہیں کامیابی ہو۔"
اور پھر امریکن ایکسپریس کے مینجر کی طرح مصطفیٰ الخیری نے بھی مجھے ایک مشورہ دیا۔
"اگر قاہرہ پہنچ کر بھی تم ناکام رہو' تو سیدھے بیروت چلے آنا' وہاں میرے بہت سے دوست احباب ہیں۔ وہ تمہیں خوب سیر کرائیں گے۔ بیروت مشرق وسطیٰ کا پیرس ہے۔

For more books visit www.4Urdu.com

وہاں کے نائٹ کلب یورپ کی نشاط گاہوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آج کل سمیعہ جمال بھی وہاں آئی ہوئی ہے۔ وہ مصر کے سابق شاہ فاروق کی محبوب رقاصہ تھی۔"

URDU4U.COM

مصر کے سابق شاہ فاروق کے ساتھ اب مجھے ایک قسم کی ذاتی رنجش پیدا ہونے لگی تھی۔ حجاز کے لیے میں جو راستہ بھی نکالتا تھا۔ اس پر وہ الف لیلیٰ کے جادوگر بادشاہوں کی طرح کسی نہ کسی صورت میں نمودار ہو کے رہتا تھا۔ کیپری میں وہ بہ نفس نفیس موجود تھا۔ بیروت میں اس کی محبوب رقاصہ تھی۔

برسلز' پیرس' جنیوا' برن' لوزان' لوگانو' میلان' فلورنس' وینس' روم------ روم میں اشفاق احمد وہاں کی یونیورسٹی میں اردو پڑھاتا تھا اور ریڈیو روم میں اردو کا پروگرام بھی کرتا تھا۔ جس وقت میں روم پہنچا' ان دنوں ریڈیو روم میں اشفاق احمد کی جواب طلبی ہو رہی تھی۔ اس زمانے میں ہندوستان کا ایک جنگی بیڑا یورپ کی کچھ بندرگاہوں کا خیر سگالی دورہ کر رہا تھا۔ ریڈیو کے اردو پروگرام میں اس دورے کی خبر کو نشر کرتے وقت اشفاق احمد جنگی بیڑے کو ہندوستان کا جنگی بٹیرا کہہ دیتا تھا اور پھر معافی مانگ کر صحیح تلفظ ادا کرتا تھا اس پر ہندوستانی سفارت خانہ نے بڑا شور مچایا کہ یہ شخص جنگی بیڑے کو جان بوجھ کر جنگی بٹیرا کہہ کر بھارت ماتا کی توہین کر رہا ہے۔ اب اشفاق احمد اردو املا میں بیڑے اور بٹیرے کی باہمی مماثلت اجاگر کر کے اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ پروفیسر الیگزنڈر باؤسانی اس مقدمے میں اس کی مدد فرما رہے تھے۔

روم میں ایک کئی منزلہ عمارت میں اشفاق احمد کے پاس ایک کمرہ تھا۔ اس نے میرا سوٹ کیس اپنے کمرے میں رکھتے ہی پوچھا۔ "لسی پیو گے؟"

روم میں لسی؟ نیکی میں پوچھ پوچھ کیا۔ میں نے فوراً حامی بھر لی۔ اشفاق مجھے بازار میں ایک اطالوی کی دکان پر لے گیا جو دودھ' دہی' مکھن' کریم اور پنیر بیچتا تھا۔ اس نے دکان میں داخل ہوتے ہی دکاندار کو "چاچا" کہہ کر پنجابی کی ایک فحش گالی دی۔ دکاندار نے بھی پے در پے دو تین پنجابی گالیاں دے کر اسے خوش آمدید کہا۔ اس کے بعد

For more books visit www.4Urdu.com

اشفاق احمد نے میرا تعارف کرایا۔ دکاندار نے پنجابی زبان میں چند گالیاں دے کر میرے ساتھ اپنی خیر سگالی کا اظہار کیا اور ہمیں نہایت لذیذ نمکین لسی بنا کر پلائی۔

URDU4U.COM

ان دنوں اشفاق کے پاس ایک سکوٹر ہوتا تھا۔ اس پر بٹھا کر اس نے مجھے روم دکھانے کا پروگرام بنایا۔ ہم تھوڑی سی دور ہی گئے تھے کہ اشفاق نے پوچھا۔ "ہمیں سکوٹر پر بیٹھ کر روانہ ہوئے تین منٹ ہو گئے؟"

"ہاں' ہو گئے" میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ ہم خیریت سے ہیں۔" اشفاق نے کہا۔" روم کی سڑکوں پر ہر تین منٹ میں ٹریفک کا ایک حادثہ ہوتا ہے۔"

نصف گھنٹہ کے بعد اشفاق نے پھر مجھے کلمہ شکر پڑھنے کی تلقین کی' کیونکہ روم میں ہر تیس منٹ کے بعد جو حادثہ ہوتا تھا وہ مہلک ثابت ہوتا ہے۔ یوں بھی سکوٹر چلاتے چلاتے ہاتھ چھوڑ کر جس طرح اشفاق احمد مجھے روم کے قابل دید مقامات کی زیارت کرا رہا تھا' اس سے یہ امر یقینی تھا کہ ہم کسی وقت بھی ٹریفک کے حادثات کے اعداد و شمار میں اضافے کا باعث بن جائیں گے۔ چنانچہ میں نے سکوٹر پر مزید سیر کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بسوں پر بیٹھنا بھی دشوار تھا' کیونکہ اشفاق کو بسوں کے حادثات کی تفصیل بھی بخوبی ازبر تھی۔ اس لیے ہم نے رومتہ الکبریٰ کی سیاحت زیادہ تر پاپیادہ کی۔ کئی روز متواتر پیدل جوتیاں چٹخاتے چٹخاتے میرے بوٹوں کا اکلوتا جوڑا دم توڑ گیا۔ نیا جوتا خریدنے میں اشفاق نے میری رہنمائی کی۔ جوتوں کی دکان میں جا کر میں نے جو پہلا جوڑا ٹرائی کیا۔ وہ فٹ تھا۔ میں نے اسے خریدنے کی ٹھانی' تو اشفاق احمد نے ڈانٹا کہ روم میں جوتا خریدنے کے یہ آداب نہیں ہیں۔ یہاں پر آٹھ دس جوتے ٹرائی کر لو' اس کے بعد دوسری جگہ چلیں گے۔ بڑی مشکل سے تیسری دکان میں جا کر کوئی پندرھواں جوڑا اشفاق کی نظر میں جچ گیا۔ وہ بڑی دیر تک دکاندار کے ساتھ اطالوی زبان میں اس جوتے کے محاسن پر گفتگو کرتا رہا۔ کسی بات پر تاؤ کھا کر دکاندار نے جوتے کا جوڑا تہہ در تہہ مروڑ کر میری پتلون کی جیب میں ڈال دیا۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ

For more books visit www.4Urdu.com

یہ جوتا بے حد نازک' سبک اور لچکدار ہے' اشفاق نے بھی میری جیب پر ہاتھ پھیر کر تصدیق کی کہ جیب میں جوتا نہیں بلکہ رومال پڑا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کچھ مزید مول تول کے بعد اشفاق نے اپنے پاس سے ساڑھے تین ہزار لیرے ادا کئے اور یہ جوتا خرید کر مجھے بطور تحفہ دے دیا۔ اس مہم کے بعد میں نے اشفاق کو الوداع کہا اور اپنا نیا جوتا پہن کر نیپلز کو روانہ ہو گیا۔

نیپلز پہنچ کر میں نے اپنا سامان ہوٹل میں رکھا اور پہلی ٹرین پکڑ کر پومپیائی کا شہر دیکھنے چل پڑا۔ اتوار کا دن تھا۔ پومپیائی کے کھنڈرات میں سیاحوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ صدیوں پہلے اس شہر کے باشندوں نے حیوانی' شہوانی اور نفسانی عیش و نشاط کو جو فروغ دیا تھا اس کے آثار ملاحظہ کر کے عبرت تو کسی آنکھ میں آنکھ میں نظر نہ آئی' البتہ حسرت کا غبار بہت سے چہروں پر چھایا ہوا تھا۔ قدم قدم پر مشتبہ شکل و صورت کے دلال جیبوں میں ہاتھ ڈالے چیلوں کی طرح منڈلا رہے تھے اور فحش تصاویر کے البم بیچنے میں مصروف تھے جن میں پومپیائی کی لذت پرستی کے عجیب و غریب مرقع جمع تھے۔ قریب ہی ماؤنٹ ویسووی اس کا جوالا مکھی پہاڑ بجھے ہوئے آتش فشانی مادے میں لپٹا ہوا کھڑا تھا۔ وقتہ فوقتہ اس کی چوٹی کا آتش فشانی دہانہ بھڑک بھڑک کر پومپیائی کے انجام کی یاد دہانی کراتا تھا لیکن سیاحوں کا جھمگھٹا عقوبت کے اس اشارے سے بے نیاز ان کھنڈروں میں دبی ہوئی جنسی بے راہروی کی لذت میں سرتاپا ڈوبا ہوا تھا۔ پومپیائی کی پتھریلی سڑکوں اور گلی کوچوں میں گھومتے گھومتے یکایک میرے نئے اطالوی جوتے کے دونوں تلے اکھڑ کر الگ ہو گئے۔ میں نے یہ نازک اور لچکدار جوتے مروڑ کر رومال کی طرح جیب میں ڈال لیے اور اس عبرت کدہ کی باقی یاترا ننگے پاؤں کی۔

شام کو نیپلز واپس پہنچا تو ہوٹل کے ڈائننگ روم میں ایک اور مشکل پیش آئی۔ جو ویٹرس میری میز پر مامور تھی وہ انگریزی زبان سے قطعی ناآشنا تھی۔ کھانے کا مینو اطالوی زبان میں چھپا ہوا تھا اور میری سمجھ سے بالکل بالاتر تھا۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ کھانے کے انتخاب کے متعلق کسی طرح اس پر اپنا مفہوم واضح کر سکوں۔ لیکن وہ ہر بار اپنی

For more books visit www.4Urdu.com

گردن مٹکا کر اور شانے اچکا کر مسکرا دیتی تھی۔ میری کمپرسی کو بھانپ کر قریب والی میز سے ایک نوجوان اٹھ کر آیا اور نہایت شستہ انگریزی میں بولا۔ "کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟"

URDU4U.COM

"شکریہ" میں نے کہا۔ "میں ویٹرس کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ میرے لیے گوشت اور شراب نہ لائے۔ اگر مچھلی یا انڈے موجود ہوں' تو وہ لے آئے' لیکن وہ سور کی چربی میں تلے ہوئے نہ ہوں۔"

ویٹرس آرڈر لے کر چلی گئی تو نوجوان نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا آپ ہندوستان کے رہنے والے ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں پاکستانی ہوں۔"

"الحمد اللہ۔" نوجوان نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "میں شام کا رہنے والا ہوں آیئے آپ ہماری میز پر آ جایئے۔ میں آپ کو اپنی منگیتر سے ملاؤں گا۔ ہم دونوں کو پاکستان سے بڑی دلچسپی ہے۔"

اپنی میز پر پہنچ کر وہ شامی نوجوان خالص مغربی انداز سے تعارف کی رسوم ادا کرنے میں مشغول ہو گیا۔ "میرا نام رشید مومن ہے۔ یہ میری منگیتر نزیہہ ہے۔ ہم دونوں دمشق کے رہنے والے ہیں۔ روم میں فنون لطیفہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آجکل نیپلز آئے ہوئے ہیں کیونکہ داناؤں نے کہا ہے:

See Naples and then die

پھر اس نے نزیہہ سے میرا تعارف کرایا۔ "آپ پاکستانی ہیں۔ الحمد اللہ ہمیں پاکستان سے بڑی محبت ہے۔ ہے نا نزیہہ؟ آپ گوشت نہیں کھاتے۔ شراب نہیں پیتے۔ غالباً سگریٹ سے بھی پرہیز ہو گا۔ انڈے اور مچھلی سے بھی بھاگتے ہیں' اگر وہ چربی میں تلے ہوئے ہوں تو۔ معلوم نہیں نزیہہ' ایسے لوگ یورپ آ کر کیا کرتے ہیں؟" رشید مومن نے طنزیہ ہنس کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ میں کوئی کمزوری نہیں ہے۔" نزیہہ نے اخلاقاً کہا۔

"جی ہاں' چھوٹی کمزوریاں تو نہیں ہیں۔" میں نے بھی مذاقاً جواب دیا۔

For more books visit www.4Urdu.com

رشید مومن نے زور کا قہقہہ لگایا۔ نزہہ کچھ جھینپ سی گئی۔

"واللہ' نزہہ' جب تم شرماتی ہو تو تمہارا چہرہ اس گلاس کی طرح عنابی ہو جاتا ہے۔"

URDU4U.COM

رشید مومن نے ریڈ وائن کا گلاس اٹھا کر کہا۔ پھر انہوں نے اپنے اپنے گلاس بلند کیے اور بڑی گرم جوشی کے ساتھ میرا جام صحت نوش کیا۔

کچھ دیر طرح طرح کی پرلطف باتیں ہوتی ہیں۔ رشید مومن کی باتوں میں نہایت سلجھا ہوا مزاح تھا۔ نزہہ کے خلوص کی سادگی بڑی دلاویز تھی۔ رفتہ رفتہ گفتگو کا رخ میرے سفر حجاز کی طرف پھر گیا۔ اگرچہ اس وقت تک رشید مومن اور نزہہ سرخ اطالوی شراب کی تین بوتلیں ختم کر چکے تھے اور ان کی آنکھوں میں سرور کی ایک لطیف سی غنودگی بھی اتر آئی تھی۔ لیکن حجاز کا ذکر آتے ہی وہ دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے۔

"آپ حجاز جا رہے ہیں؟ آپ بڑے خوش نصیب ہیں۔ واللہ آپ بہت ہی خوش نصیب ہیں۔" نزہہ نے بڑے جوش سے کہا۔ اب اس کی آنکھوں میں عقیدت کی ایک ایسی چمک' ایک ایسا کیف چھلک آیا تھا جو سرخ اطالوی شراب کے نشے سے کہیں زیادہ گہرا اور خوشنما تھا۔

"آپ نزہہ کی باتوں میں نہ آئیں۔" رشید مومن نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ "سب جوان لڑکیاں وہمی اور زود اعتقاد ہوتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ حجاز پہنچ کر آپ بہت پشیمان ہوں گے۔"

"خدا کے لیے رشید ایسی باتیں نہ کرو۔" نزہہ نے احتجاج کیا۔ "اگر تم ایسی باتیں کرو گے تو میں تمہیں کبھی معاف نہ کروں گی۔ خدا کی قسم' کبھی معاف نہ کروں گی۔"

"میرا تجربہ ہے کہ نزہہ کا غصہ ہمیشہ عارضی ہوتا ہے۔" رشید مومن نے لاپروائی سے کہا "میں اس کی وقتی خفگی گوارا کر لوں گا' لیکن حجاز کے متعلق اپنے دوست کو کسی قسم کی لاعلمی میں مبتلا نہ رہنے دوں گا۔"

ہوٹل ٹرمینس کے ڈرائینگ روم مین بیٹھے بیٹھے اب رشید مومن کے تن بدن میں ان مغربی

For more books visit www.4Urdu.com

مستشرقین کی روح حلول کر آئی تھی جنہوں نے حج اور اسلام کے متعلق گمراہ کن کتابیں لکھ لکھ کر اپنے زہریلے تعصبات کو علم و دانش کا لباس پہنا رکھا ہے۔ رشید مومن
URDU4U.COM
کا ذہن بھی اس علم کے زیور سے پوری طرح آراستہ تھا۔ اس نے یہ غلیظ مواد ایک متعفن قے کی طرح ہمارے سامنے میز پر انڈیلنا شروع کر دیا۔ ریڈ وائن کی ترنگ میں وہ بڑے جوش و خروش سے اپنی خرافات بکتا رہا اور نزہہ اس کے سامنے ایک زخم خوردہ ناگن کی طرح بیٹھی بل کھاتی رہی۔ وہ بار بار اپنے گلاس کو غصے سے چھلکاتی تھی۔ کبھی بوتلوں کو اٹھا اٹھا کر زور سے میز پر مارتی تھی کبھی نیپکن کو اپنی کلائی کے گرد یوں بھینچ کر لپیٹتی تھی کہ اس کی سڈول بانہوں میں خون کی رگیں ابھر کر بڑی حدت سے کپکپانے لگتی تھیں۔ نزہہ کی آنکھوں سے ڈر لگتا تھا کہ شاید ابھی ان سے آگے کے دو شعلے لپک پڑیں گے۔ اس کے چہرے کے اثار بتا رہے تھے کہ اگر اس نے زبان کھولی تو اس کے ذہن سے زہر کے فوارے پھوٹ کر بہنے لگیں گے۔ ہماری میز پر بڑا شدید تناؤ چھا رہا تھا۔ گفتگو کا رخ بدلنے کے لیے میں نے آرکسٹرا کی تعریف شروع کر دی جو ایک نئے ڈانس کی سریلی دھنیں بجا رہا تھا۔

"بے شک آرکسٹرا بڑی حسین موسیقی بجا رہا ہے۔" رشید مومن نے گویا چونک کر کہا۔

"تم دونوں یہاں بیٹھ کر دین کی باتیں کرو۔ میں اس اطالوی لڑکی کے ساتھ ناچنا چاہتا ہوں جو بے چاری بہت دیر سے تنہا بیٹھی ہے۔"

رشید مومن نہایت بھدے پن سے اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ایک دوسری میز پر چلا گیا' جہاں ایک خوبصورت اور آراستہ لڑکی لائم جوس سے جی بہلا رہی تھی۔ اس نے رشید مومن کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور کچھ دیر بعد لائم جوس چھوڑ کر وہ شمپین پینے میں مشغول ہو گئے۔

رشید مومن دیر تک اس لڑکی کے ساتھ ڈانس کرتا رہا۔ نزہہ اپنی کرسی پر بت بنی بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب حسرت' ایک عمیق غصہ اور ایک شدید انتقام چھلک رہا تھا۔ وہ بار بار کچھ بولنا چاہتی تھی' لیکن اس کے ہونٹ کپکپا کر' کچکچا کر رہ جاتے

For more books visit www.4Urdu.com

تھے۔

آدھی رات گئے جب ہوٹل ٹرمینس کا بال روم بند ہونے لگا تو رشید مومن اطالوی لڑکی کے بازو میں بازو ڈالے ہمارے پاس آیا۔ دونوں نشے میں دھت تھے۔

URDU4U.COM

"یہ کیا واہیاتی ہے" رشید مومن ناراض ہونے لگا۔ "ابھی رات شروع بھی نہیں ہوئی اور یہ کم بخت ہوٹل والے ڈانس بند کر رہے ہیں۔ چلو ہم سب کاسینو چلیں۔ وہ صبح تک کھلا رہتا ہے۔"

"میں بہت تھک گئی ہوں۔ تم خوشی سے جاؤ۔" نزہہ نے بیزاری سے کہا۔

"بہت اچھا۔ شب بخیر۔ مجھے امید ہے کہ ہمارا پاکستانی بھائی بدستور تمہارا دل بہلاتا رہے گا۔ خدا کی قسم' پاکستانی بڑے اچھے لوگ ہیں۔ شراب نہیں پیتے۔ سور نہیں کھاتے۔ گرمیوں کے موسم میں حج پر جاتے ہیں اور نزہہ جیسی خوبصورت لڑکیوں کا جی بہلاتے ہیں..... ہاہاہا.....ہاہاہا....." رشید مومن پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتا' جھومتا' لڑکھڑاتا ہوا اطالوی لڑکی کے ساتھ باہر چلا گیا۔

کچھ دیر نزہہ میز پر کہنیاں ٹیکے دم بخود بیٹھی رہی۔ اس کا سر اس کی ہتھیلیوں کے درمیان جھکا ہوا تھا۔ مجھے یہ فکر دامن گیر تھی کہ اگر اب اس نے رونا شروع کر دیا' تو میں کیا کروں گا؟ ہر لحہ مجھے ڈر لگتا تھا کہ میز پر پڑے ہوئے مینو کارڈ پر اچانک ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگیں گے اور میں دل ہی دل میں ان الفاظ اور فقروں کی تلاش کر رہا تھا' جو ایسے نازک موقعوں پر لڑکیوں کی دلجوئی کے لیے استعمال ہوا کرتے ہیں' لیکن خدا کا شکر ہے کہ نزہہ نے مجھے اس آزمائش سے بال بال بچا لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نے اپنی ہتھیلیوں سے سر اٹھایا' تو اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں------ سوکھی ہوئی ٹہنیوں کی طرح جو چنگاری دیکھتے ہی بھک سے شعلہ پکڑ لیتی ہیں۔ اس کا چہرہ تھکن آلود تھا اور اس نے نیم غنودگی کے عالم میں کہا۔ "آؤ ہم بھی کسی دوسرے نائٹ کلب میں چل کے بیٹھیں۔ یہاں پر مجھے سخت وحشت ہو رہی ہے۔"

"آپ بہت تھک گئی ہیں۔" میں نے کہا۔" آپ اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں

For more books visit www.4Urdu.com

تو زیادہ بہتر ہو گا۔"

"نہیں۔ میں اپنے کمرے میں ہرگز نہ جاؤں گی۔ اس وقت اگر میں اکیلی رہ گئی' تو رو رو کر میرا برا حال ہو جائے گا۔"

"آپ اکیلی نہیں ہوں گی۔" میں نے کہا۔ "جب تک آپ کو نیند نہ آ جائے میں آپ کے پاس بیٹھوں گا۔"

نزہت کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی' "ہمارے ملک میں ایک کہاوت ہے کہ اگر مرد اور عورت کسی جگہ اکیلے رہ جائیں' تو ان کے ساتھ تیسرا ساتھی شیطان ہو جاتا ہے۔"

"شیطان کے ساتھ میرے بھی دیرینہ مراسم ہیں۔" میں نے مذاقاً کہا۔ "لیکن اب میں نے اس کے داؤ پیچ سے بچنا سیکھ لیا ہے۔"

نزہت ہنسنے لگی۔ اوپر جانے کے لیے جب ہم لفٹ میں سوار ہوئے تو نزہت کے ساتھ رشید مومن کی جگہ ایک اجنبی کو دیکھ کر لفٹ بوائے عجیب انداز سے مسکرایا۔

"آپ کی شب خوش خوش بسر ہو۔" لفٹ بوائے نے شرارت سے ایک آنکھ میچ کر کہا۔

"شکریہ۔" میں نے اسے ایک سو لیرا کا ٹپ دیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر نزہت کہنے لگی۔ "اب اگر میں ساری عمر ایک فرشتہ بن کے رہوں پھر بھی لفٹ بوائے کی نظر میں تو وہی رہوں گی جو اس نے مجھے اس وقت سمجھا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "انسان غلط فہمیوں کا پتلا ہی تو ہے۔"

"ہمارے ملک میں اسے گناہ بے لذت کہتے ہیں۔" نزہت کہنے لگی۔

"گناہ کا امکان گناہ سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ بری بات ہو جائے تو وہ ماضی کا ایک واقعہ بن جاتا ہے' جس کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے اور آئندہ اس سے بچ کر رہنا بھی انسان کے اپنے اختیار میں ہے' لیکن بری بات کا امکان خون میں رچے ہوئے زہر کی طرح ہر وقت رگ و پے میں گردش کرتا رہتا ہے۔"

نزہت نے بستر سے کمبل اٹھا کر اپنے جسم پر لپیٹ لیا اور صوفے کی بڑی کرسی پر تکیہ

For more books visit www.4Urdu.com

لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ "یہ عجیب بات ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی فریب سے آلودہ ہوتا ہے۔ کبھی ہم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ کبھی دوسرے ہمارے متعلق دھوکا کھانے لگتے ہیں۔"

URDU4U.COM

نزہہ اب اچھے موڈ میں تھی۔ اس نے سگریٹ سلگا کر اپنا سگریٹ لائٹر مجھے دیا۔ "اس سگریٹ لائیٹر کو دیکھو۔ اس پر بڑی خوبصورتی سے لاالٰہ الا اللہ محمد رسوال اللہ نقش کیا ہوا ہے۔ امریکن کمپنیاں یہ لائیٹر خاص طور پر اسلامی ممالک کے لیے بنا کر بھیجتی ہیں۔"

"پہلے کلمہ طیبہ سے ایمان کی شمع روشن ہوتی تھی۔ اب اس کی مدد سے سگریٹ سلگائے جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

نزہہ ہنسنے لگی۔ اب وہ لفٹ بوائے مجھے جو جی چاہے سمجھے' لیکن دمشق میں میری بزرگ ماں کسی اور ہی خیال میں مسرور ہو گی۔ شاید اس وقت وہ میرے لیے دعا مانگ رہی ہو۔ شاید وہ سوچ رہی ہو کہ میں اب بھی اسی پابندی سے نماز اور قرآن پڑھتی ہوں۔ جس طرح اپنے گھر میں پڑھا کرتی تھی۔"

نزہہ نے کروٹ لے کر اپنا اٹیچی کیس کھولا' جو صوفے کے قریب ایک تپائی پر پڑا تھا۔ اور اس میں سے ریشمی غلاف میں لپٹا ہوا چھوٹی تقطیع کا قرآن مجید نکالا۔

"جب میں یورپ آ رہی تھی' تو میری ماں نے مجھے یہ تحفہ دیا تھا۔ سال بھر سے میں نے اسے ایک بار بھی کھول کر نہیں دیکھا' لیکن میں جہاں کہیں جاتی ہوں اسے اپنے ساتھ ضرور رکھتی ہوں۔"

"یہ بھی آپ کی عین سعادت مندی ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے یہ وہم سا ہو گیا ہے کہ اگر قرآن مجید کی یہ جلد مجھ سے جدا ہو گئی تو شاید میری پیاری ماں کو کچھ ہو جائے گا۔"

"دنیا کی الہامی کتابوں میں قرآن شریف بڑا مظلوم صحیفہ ہے۔" میں نے جان بوجھ کر طنز سے کہا۔ "کچھ لوگ اسے تعویذ بنا کر گلے میں یا بازوؤں پر باندھتے ہیں۔ بعض لوگ پاکٹ سائز کے قرآن جیبوں میں رکھتے ہیں۔ یوں بھی ہر مسلمان گھرانے میں ایک

For more books visit www.4Urdu.com

دو قرآن خوبصورت غلافوں میں لپیٹ کر ضرور رکھے جاتے ہیں خواہ وہ طاق نسیاں کی زینت ہی کیوں نہ ہوں آپ نے بھی ایک جلد اٹیچی کیس میں بند کر کے رکھ چھوڑی ہے' تو یہ رسم زمانہ کے عین مطابق ہے۔"

URDU4U.COM

اب نزہہ کا موڈ بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور مجھے تسبیحوں کے قصے سنانے لگی۔ کس طرح مشرق وسطیٰ میں کچھ لوگ اپنے ہاتھ میں ہر وقت تسبیح لیے پھرتے ہیں۔ بعض عادتاً' بعض فیشن کے طور پر' بعض محض اعصاب کی آسودگی کے لیے۔

کچھ دیر کے لیے جب میں رخصت ہونے لگا' تو نزہہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی' پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ میرے لیے ایک تکلیف گوارا فرمائیں گے؟"

"بسروچشم۔" میں نے جواب دیا۔

نزہہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ "جب آپ خانہ کعبہ کی زیارت کریں' تو وہاں پر فقط ایک بار میرا نام لے دیں۔"

"یہ تو بڑی آسان فرمائش ہے۔" میں نے کہا۔ "وہاں پر میں آپ کے لیے دعا بھی ضرور مانگوں گا۔"

"آپ ایک بار بس میرا نام ہی لے دیں۔ اس سے زیادہ مجھے کوئی اور حق بھی تو نہیں۔" نزہہ نے اس نمی کو چھپانے کی ناکام سی کوشش کی جو معاً اس کی خوبصورت آنکھوں میں اتر آئی تھی۔

"میں ضرور آپ کی فرمائش پوری کروں گا۔ ایک بار نہیں' کئی بار' اور جب میں روضہ اقدس پر حاضر ہوں گا' تو آپ کا سلام بھی ضرور عرض کروں گا۔"

روضہ اقدس کے ذکر پر نزہہ نے جلدی سے اپنے گلے کا ریشمی سکارف اتار کر اس سے سر ڈھانپ لیا۔ پھر کچھ کہنا چاہا' لیکن ہچکچا کر خاموش ہو گئی۔

لفٹ بوائے لفٹ سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنی ٹوپی درست

For more books visit www.4Urdu.com

کی' اور کن انکھیوں سے گھور کر مسکرایا' میں نے پھر اسے ایک سو لیرا کا ٹپ دیا۔ کچھ دیر بعد جب رشید مومن واپس آئے گا' تو اسے دیکھ کر یہ لفٹ بوائے ایک بار پھر کن انکھوں سے گھور کر مسکرائے گا۔ شاید رشید مومن بھی اسے ایک سو لیرا کا ٹپ دے۔

اور میں آج تک احساس کے اس گداز پر رشک کرتا ہوں جو نزہہ کے مقدر میں اسے نصیب تھا۔ نزہہ جو ریڈ وائن پی کر بھی رشید مومن سے روٹھ جاتی ہے' کیونکہ وہ حج کے متعلق بے سروپا باتیں کرتا ہے۔ نزہہ جو اب قرآن نہیں پڑھتی' لیکن اپنی ماں کا تحفہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ نزہہ جس کے نزدیک خدا کے گھر پر اس کا صرف اتنا حق ہے کہ ایک اجنبی فقط ایک بار اس کا نام وہاں لے دے۔ نزہہ جو روضہ اقدس کے نام پر اپنے سکارف سے اپنا سر ڈھانپ لیتی ہے۔ نزہہ جو اپنا سلام وہاں پیش کرنے سے بری طرح ہچکچاتی ہے۔

تو غنی ازہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر
از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر

نیپلز کی بندرگاہ سے ایس۔ ایس۔ اینوترانے لنگر اٹھایا تو جہاز میں بڑی چہل پہل تھی۔ یہ سیاحی جہاز تھا جو اپنے مسافروں کو بحیرہ روم کی گشت کراتا ہوا کیپری' بیروت اور اسکندریہ کی سیر کرانے نکلا تھا۔ مسافروں میں زیادہ تعداد تماش بین سیاحوں کی تھی۔ کچھ عرب طلباء تھے جو یورپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے اپنے وطن واپس جا رہے تھے۔ چار عیسائی پادری تھے جو لمبے لمبے لبادے پہنے مسیحت کی تبلیغ کے لیے مصر جا رہے تھے۔ آٹھ فرانسیسی نرسیں تھیں جو بیروت کے کسی مشنری

For more books visit www.4Urdu.com

ہسپتال میں ڈیوٹی پر حاضر ہو رہی تھیں۔

کیپری میں مصر کا سابق شاہ فاروق تو ہمیں کہیں نظر نہ آیا' البتہ جوالا مکھی پہاڑ اسٹرمبولی کے دہانے سے آتش فشاں شعلوں کو بھڑک بھڑک کر بلند ہوتے کئی بار دیکھا۔ کیپری کا جزیرہ مسیحی پادریوں کو خاص طور پر راس آیا۔ فرانسیسی نرسوں پر قبضہ جما کے وہ کئی گھنٹوں کے لیے غائب ہو گئے اور جب جہاز میں واپس آئے تو سب کے چہروں پر ساغر و مینا کی کرامات تھی اور ہاتھوں میں اطالوی شراب کی دو دو صراحیاں تھیں۔

ایس۔ ایس۔ اینوترا بڑی مست خرامی سے چلا جا رہا تھا۔ بحر روم غیر معمولی حد تک پرسکون تھا۔ سورج کی کرنوں میں اس کی شفاف نیلگوں لہریں زرکار شامیانوں کی طرح جھلملاتی تھیں۔ خوش قسمتی سے ان دنوں چاندنی بھی پورے شباب پر تھی۔ رات کے سناٹے میں رہ رہ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ ہم کسی طلسماتی سفینہ پر بیٹھے ایک ایسی دنیا میں سفر کر رہے ہیں جس کی فضا احساس سے بھی زیادہ نازک اور خیال سے بھی زیادہ رنگین ہے۔ سکوت شب میں انجن کی دھیمی دھیمی مسلسل بھک بھک' جہاز کے قدموں میں بچھ بچھ کر ابھرنے والی موجوں کے جل تھل ساز' آسمان پر تاروں کے جگمگاتے ہوئے ہیرے اور جواہرات' چاندنی میں دھلی ہوئی بھیگی بھیگی فضا' لہروں کے زیروبم میں مہتابی کرنوں کے پیچ و خم' جیسے نیلم کی کان میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہوں------ جوں جوں رات جوان ہوتی جاتی تھی ماحول کی اس خوبصورتی پر ایک عجب دیوانگی' ایک شدید جنون پھیلنے لگتا تھا' جیسے انسان کے دل پر غم اترتا ہے۔ ارض و سما کے درمیان ایک بے آواز سسکی لرزنے لگتی تھی اور چاروں طرف پھیلا ہوا بے پایاں سمندر ایک آنسو کا نگینہ بن جاتا تھا۔

موٹے موٹے شیشوں کی عینک والی ایک آرٹسٹ نما لڑکی جو نیپلز سے ہمارے ساتھ سوار ہوئی تھی۔ دن کا بیشتر حصہ اپنے کیبن کے اندر گزارا کرتی تھی' لیکن ڈنر کے بعد وہ اپنا کمبل اٹھا کر ڈیک پر آ جاتی تھی۔ کبھی وہ کمبل لپیٹ کر آرام کرسی پر دراز ہو جاتی تھی۔ کبھی ڈیک کے جنگلے پر جھک کے لٹک جاتی تھی۔ کبھی بے چینی سے ادھر

For more books visit www.4Urdu.com

ادھر گھومنے لگتی تھی..... صبح کے وقت جب وہ ڈائننگ روم میں ناشتہ کی میز پر نظر آتی' تو مجھے ایک گونہ خوشی کا احساس ہوتا کیونکہ مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ شاید کل رات اس نے چاندنی کے سمندر میں چھلانگ لگا دی ہو۔

URDU4U.COM

تیسرے روز صبح سویرے بیروت کا ساحل نظر آنے لگا۔ عرب طالب علم دوڑ دوڑ کر سب سے اوپر والے عرشہ پر چڑھ گئے اور بڑی خوش الحانی سے اپنے اپنے قومی ترانے گانے لگے۔ فرانسیسی نرسوں کو خاص طور پر یہ گیت بہت پسند آئے' لیکن مسیحی پادریوں نے انہیں ان نوجوانوں کے ساتھ گھلنے ملنے سے بڑی ہنر مندی سے باز رکھا۔

جب جہاز بندرگاہ میں داخل ہوا تو سب سے پہلے جو چیز نظر آئی' وہ بہت سے لوگوں کا ہجوم تھا جو ساحل پر کھڑے زور زور سے چیخ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں اور گردنوں کے خشمگیں اشارے بھی برابر ان کی آواز کا ساتھ دے رہے تھے۔ دور سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساحل پر بلوہ ہو رہا ہے۔ جب ہم نزدیک پہنچے تو گمان گزرا کہ شاید وہ لوگ جہاز والوں کو غصے سے گالیاں دے رہے ہیں۔ لیکن کچھ دیر یہ راز کھلا کہ دراصل یہ لوگ بندرگاہ کے قلی ہیں۔ اور یہاں اترنے والے مسافروں کو اپنی اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں۔ ساحل پر جا بجا سرخ سرخ ٹوپیاں نظر آتی تھیں جن کے کناروں پر تیل کی چکنائی اور تہہ در تہہ جمی ہوئی گرد خاص طور پر نمایاں تھی۔ یوں شور و غل' ریل پیل' دھکم دھکا کافی عام تھے اور اس دشت کو دیکھ کر بے اختیار گھر یاد آتا تھا۔ پولیس کے سپاہی غیر معمولی طور پر موٹے تھے اور اس گرمی میں اپنی وردیوں سے بیزار نظر آتے تھے۔ یہ سپاہی زیادہ تر ٹھیلوں یا کھمبوں کا سہارا لیے اونگھ رہے تھے اور جب ان کی آنکھ کھلتی تھی تو وہ کسی کو دھکا دے کر' کسی کو زور سے ڈانٹ ڈپٹ کر اپنے فرائض منصبی سے عہدہ برآ ہو جاتے تھے۔

فرانسیسی نرسوں کی منزل آ گئی تھی اور وہ اپنا سامان اتروا کر اب مسیحی پادریوں سے رخصت ہو رہی تھیں۔ پادریوں نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں دیر تک سہلایا

For more books visit www.4Urdu.com

اور پھر انہوں نے بڑی بے صبری سے نرسوں کے چٹاخ چٹاخ الوداعی بوسے لیے۔ ان کی حسرت بھری نگاہیں دور تک نرسوں کا پیچھا کرتی رہیں جو ساحل پر پہنچتے ہی اپنے اپنے چہروں کا میک از سر نو درست کرنے میں مشغول ہو گئی تھیں۔ بوسے روحانی ہوں یا نفسانی' عورتوں کے پاؤڈر اور لپ اسٹک پر ان کا اثر ایک ہی سا ہوتا ہے۔

یہاں پر جہاز نے چند گھنٹے رکنا تھا۔ بیروت کا شہر دکھانے کے لیے ایک ٹورسٹ ایجنسی نے بہت سی ٹیکسیوں کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ جیسی شاندار ٹیکسیاں یہاں نظر آئیں۔ ویسی موٹر کاریں یورپ کے بڑے بڑے شہروں کو بھی کم ہی نصیب ہوتی ہونگی۔ فورڈ' شیورلے اور بیوک کے ماڈل عام تھے کہیں کہیں کیڈی لک کاریں بھی ٹیکسیوں کے طور پر چلتی نظر آتی تھیں۔ یوں بھی بیروت کے چہرے مہرے پر کئی طرح کا بین الاقوامی رنگ و روغن چڑھا ہوا ہے۔ زبان اور آداب میں یہ شہر فرانسیسی ہے۔ موٹروں کے ماڈل' بش شرٹوں کے ڈیزائن' اور یونیورسٹی ڈگریوں کے لحاظ سے یہ شہر امریکن ہے۔ ہوٹلوں کے کاروبار اور پرفضا پہاڑی مقامات کی نسبت سے نہ صرف بیروت بلکہ سارا لبنان مشرق وسطیٰ کا سوئٹزرلینڈ ہے اور جیسا کہ میرے لبنانی دوست مصطفیٰ الخیری نے مجھے ہالینڈ میں بتایا تھا' بیروت کی نشاط گاہوں اور نائٹ کلبوں کو پیرس کی ہمسری کا بھی بجا طور پر دعویٰ ہے۔ چنانچہ بہت سے عرب شہزادے جو اپنے ملک یا اپنے محلات میں شراب پینے سے معذور ہیں۔ اپنے پرائیویٹ ہوائی جہازوں میں جوق در جوق یہاں آتے ہیں اور راتوں رات دادعیش دے کر صبح سویرے اپنے فرائض منصبی پر واپس حاضر ہو جاتے ہیں۔

میری ٹیکسی کے ڈرائیور نے بڑے فخر کے ساتھ مجھے وہ ہوٹل بھی دکھایا جس میں مصر کے سابق شاہ فاروق کی محبوب رقاصہ سمیعہ جمال اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ ہوٹل کے دروازے پر سمیعہ جمال کی ایک بہت بڑی تصویر آویزاں تھی۔ تصویر میں اس کے بال بادلوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے اور وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے باہر چوک کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ جہاں ایک پولیس کانسٹیبل نہایت مستعدی سے ٹریفک کنٹرول

For more books visit www.4Urdu.com

کرنے میں مصروف تھا۔ سمیعہ جمال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میری ٹیکسی کے ڈرائیور نے پہلے ایک راہ گیر کو اور پھر چوک والے ٹریفک کانسٹیبل کو اپنی زد میں لینے کی سر توڑ کوشش کی۔ راہگیر بے چارا تو کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا' لیکن ٹریفک کانسٹیبل نے سیٹی بجا کر ہمارا تعاقب کرنے کی تھوڑی بہت کوشش کی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ایکسی لیٹر دبا کر رفتار اور بھی تیز کر دی اور ہم خطرناک پہاڑی موڑوں اور پیچدار راستوں کو کسی غیبی معجزے کی مدد سے طے کرتے ہوئے ٹریفک کانسٹیبل اور سمیعہ جمال دونوں کی زد سے باہر نکل آئے۔

روم کی طرح بیروت کی سڑکوں پر بھی مجھے ہر دم یہی احساس ہوتا تھا کہ ہم ایک مسلسل حادثے کی زد میں معلق ہیں۔ کھلی سڑکیں ہوں یا گنجان آباد گلیاں' ٹیکسی ہر جگہ ایک ہی رفتار سے چلنے پر مصر تھی۔ ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ کوٹ پتلون والے راہگیروں کے درمیان تو وہ بڑے اطمینان سے ہارن بجاتا ہوا گزر جاتا ہے' لیکن عباؤں والے لوگوں کو دیکھ کر وہ بے اختیار تذبذب میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس بات کی مزید وضاحت اس نے یوں کی کہ پتلون والے راہگیر کی ٹانگیں دور سے صاف نظر آ جاتی ہیں اور ڈرائیور آسانی سے دیکھ سکتا ہے کہ وہ کس طرف جا رہا ہے۔ اس کے برعکس عبا کے نیچے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ موٹر کو دیکھ کر ان ٹانگوں کا رخ آگے کی طرف مائل ہے یا پیچھے کی طرف۔ میں نے اعتراف کیا کہ مغربی لباس کا یہ افادی پہلو اب تک میری نظر سے پوشیدہ تھا۔

امریکن یونیورسٹی کے قریب ایک فیشن ایبل ریستوران کے سامنے ٹیکسی روک کر ڈرائیور نے مجھے آگاہ کیا کہ کوئی خوش مذاق سیاح اس ریستوران میں بنیر کا گلاس یا چائے کی پیالی نوش کئے بغیر بیروت سے واپس نہیں جاتا۔ اپنی سیاحت اور خوش مذاقی کی لاج رکھنے کے لیے میں نے بھی اندر جا کر چائے کا آرڈر دیا۔ ریستوران میں اکثر لوگ غیر ملکی تھے اور غالباً وہ سب سیاح تھے اور یہاں اپنی ٹیکسیوں کے ڈرائیوروں کی ہدایات

For more books visit www.4Urdu.com

کے مطابق اپنی خوش مذاقی کی داد دینے آئے تھے۔

ایک نوجوان بیرے نے مجھے چائے لا کر دی۔ اس کی باریک باریک تیکھی مونچھیں تھیں اور اپنی سفید وردی میں وہ جاسوسی ناولوں کا پراسرار ہیرو دکھائی دیتا تھا جو بھیس بدل کر کسی گہرے راز کی تلاش میں ہوٹلوں کی ملازمت کر رہا ہو۔ چائے کی ٹرے میز پر رکھ کر وہ میرے پاس مودب کھڑا ہو گیا اور فرنچ نما انگریزی میں بولا۔ "آپ کون ہیں؟"

"میں پاکستانی ہوں۔"

"مرحبا' مرحبا۔" بیرے نے خوشی سے ہاتھ مل کر کہا۔

"اور آپ؟" میں نے بھی اخلاقاً دریافت کیا۔

"الحمدللہ' میں مسلمان ہوں"

بیرے کے اس بے ساختہ جواب نے مجھے چونکا دیا۔ عربوں کے متعلق مشہور تھا کہ وہ سب سے پہلے عرب ہوتے ہیں۔ پھر شامی' یا لبنانی یا عراقی یا مصری ہوتے ہیں اور اس کے بعد کہیں جا کر مسلمان کہلانا پسند کرتے ہیں' لیکن یہ نوجوان بیرا نہ صرف سب سے پہلے مسلمان تھا' بلکہ وہ اپنے مسلمان ہونے پر بغیر کسی حجاب کے خدا کا شکر بھی ادا کر رہا تھا۔

"مجھے بھی مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہے۔" میں نے کہا۔

"الحمدللہ۔ الحمد للہ۔" بیرے نے اپنے ہاتھ پھر خوشی سے ملے۔ "آپ نے اخوان المسلمین کا نام سنا ہے۔"

"اخوان کو کون نہیں جانتا؟" میں نے جواب دیا۔

"میں بھی اس تحریک کا ایک ادنیٰ سا خادم ہوں۔" بیرے نے فخر سے کہا۔

"ہم ساری دنیا کے مسلمانوں کے بھائی اور خدمت گار ہیں۔"

"کیا آپ پاکستان کی فارن سروس میں ہیں؟" بیرے نے اچانک پوچھا۔

"جی نہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ کو یہ خیال کیوں آیا؟"

For more books visit www.4Urdu.com

"مشرق وسطیٰ میں جو سیاح آتے ہیں' وہ اکثر سفارت خانوں کے افسر ہوتے ہیں یا وہ گرجوں کے مشنری ہوتے ہیں یا ان کا تعلق تیل کی سیاست سے ہوتا ہے۔" بیرے کے چہرے پر اب غیر معمولی سنجیدگی آ گئی تھی۔ "سفارت خانوں سے وہ ہماری حکومتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ گرجوں کے ذریعہ وہ ہمارے دین میں دخل دیتے ہیں اور تیل کی سیاست سے وہ ہماری معاش پر کنٹرول رکھتے ہیں۔"

بیرے نے کن انکھیوں سے ادھر ادھر دیکھا اور گردن جھکا کر سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔ "ہم اخوان ایسے سیاحوں پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔"

بیروت کے مضافات میں جابجا چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں کی آبادیاں پھیلی ہوئی تھیں ان میں فلسطین کے مہاجر رہتے تھے مہاجر کراچی میں ہوں یا بیروت میں' ان کے جھونپڑوں پر وہی کثافت اور ان کے چہروں پر وہی فلاکت برستی ہے۔ جس طرح کراچی میں مہاجر بستیوں کے درمیان بڑی سرعت سے سیمنٹ کی بڑی بڑی عمارات بلند ہو رہی تھیں' اسی طرح فلسطینی مہاجروں کے گرد و پیش بھی بلند و بالا خوبصورت مکان تعمیر ہو رہے تھے۔ چند امریکن سیاح جو ان جھونپڑوں اور مکانوں کی تصویریں کھینچ رہے تھے' ساتھ ہی ساتھ عربوں کی سیاست پر بھی بڑی بے تکلفی سے رائے زنی فرما رہے تھے۔

"خدا کی قسم۔" ایک سیاح کہہ رہا تھا۔ "جس وقت ان جھونپڑوں والوں نے اٹھ کر ان خوبصورت عمارتوں کو جلانا شروع کر دیا اسی روز مشرق وسطیٰ میں کمیونزم کا سیلاب آ جائے گا۔"

"بائی جو تم میرے پالتو خرگوش کے بچوں سے بھی زیادہ کوتاہ اندیش ہو۔" دوسرے سیاح نے اپنے ساتھی کو پیار سے گالی دی۔ "کمیونزم آگ لگنے کا انتظار نہیں کیا کرتا۔ کمیونزم کا راستہ تو اسی روز ہموار ہو گیا تھا جب عربوں کے ہاتھ میں لاانتہا تیل کی دولت آئی اور ان غلیظ جھونپڑوں کو مکانوں میں تبدیل کرنے کی بجائے ان کے درمیان یہ نامعقول عمارتیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔"

"تم دونوں کتیا کے بچے ہو۔" تیسرے امریکن نے فتویٰ صادر کیا۔ "جب تک یہاں پر

For more books visit www.4Urdu.com

مذہب کا جذبہ غالب ہے کمیونزم کے آنے یا نہ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"
مذہب کا یہ کارآمد جذبہ غالب رکھنے کے لیے مغربی ممالک بھی حسب توفیق اپنا فرض انجام
URDU4U.COM
دینے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ نزہہ کے پاس جو سگریٹ لائٹر تھا' اس پر نقرئی حروف
میں بڑا خوبصورت کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ بیروت اور بغداد اور دمشق اور قاہرہ میں ایسے
سگریٹ لائٹر جا بجا فروخت ہوتے ہیں۔ ایک امریکن کمپنی نے خانہ کعبہ کی تصویر والی
بنیانوں اور جرسیوں کا ڈول بھی ڈالا ہے۔ بہت سے مغربی سفارت خانے اپنے ملازمین
کو خفیہ طور ر متنبہ کرتے ہیں کہ مشرقی ممالک میں کچی سبزیاں' سلاد اور ٹماٹر نہ کھایئے'
کیونکہ ان میں عورتیں ہوتی ہیں۔ جب تک مشرقی عورتیں خود آنکھ نہ لڑائیں۔ ان سے
آنکھ نہ ملایئے' کیونکہ اس سے ان کا اخلاق خراب ہوتا ہے اور جب تک صاحب خانہ
خود شراب نہ پیئے' اس سے شراب نہ مانگئے کیونکہ اس سے ان کا مذہب بگڑ جاتا
ہے۔
بندرگاہ کے قریب ایک کھلا میدان ٹاٹ اور ٹین اور چٹانوں کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں
سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میدان کے چاروں طرف کانٹوں والی لوہے کی تار کھینچی ہوئی
تھی اور جگہ جگہ پولیس کے کچھ سپاہی پہرے پر مامور تھے۔ اس میدان میں سینکڑوں
مرد اور عورتیں بھیڑ بکریوں کی طرح محصور تھیں۔ تمازت آفتاب میں سارا میدان انگیٹھی
کی طرح دہک رہا تھا' اور کچھ ضعیف عورتیں ایک چادر کو پانی میں تر کر کے بار بار
اپنے چہروں پر مل رہی تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ فلسطینی مہاجر نہیں
بلکہ یہ میدان حاجیوں کا کیمپ ہے جو حکومت نے خود اپنے خرچ سے قائم کر رکھا ہے۔
کئی کئی مہینوں تک دور دراز سے لوگ آ آ کر اس کیمپ میں جمع ہوتے رہتے ہیں جو
خوش نصیب ہیں ان کو کسی ہوائی جہاز یا سمندری جہاز میں جگہ مل جاتی ہے۔ باقی لوگ
انتظار کر کے واپس لوٹ جاتے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور کے اعداد و شمار کے مطابق اس کیمپ
میں ایسے لوگ بھی تھے جو دو دو' تین تین' چار چار سال سے مسلسل یہاں آ کر مہینوں
انتظار کرتے تھے اور پھر بے نیل و مرام واپس چلے جاتے تھے۔

For more books visit www.4Urdu.com

حاجی کیمپ کے ایک گوشے میں عصر کی جماعت ہو رہی تھی۔ باقی بہت سی جگہوں کی طرح اس کیمپ میں بھی حاجی زیادہ تھے اور نمازی کم۔ ایک بے حد بوڑھی عورت بڑے خضوع و خشوع سے سربسجود تھی۔ اس کی چادر میلی تھی اور کرتے کا دامن پھٹا ہوا تھا۔ اپنے آس پاس حقے کا شغل کرتے ہوئے بہت سے لوگوں کے برعکس حج کی طلب میں اس نے محض انتظار کا دامن نہیں پکڑا تھا' بلکہ وہ نماز کا دامن پکڑے بیٹھی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے بڑے پتے کی بات کہی کہ مسلمانوں میں جہاں کہیں کچھ برکت اور فراغت کے آثار پائے جاتے ہیں وہ ایسے ہی انفاس قدسیہ کے دم قدم سے قائم ہیں۔ اگر یہ بزرگ ماں بھی نماز چھوڑ کر حقہ گڑگڑانے بیٹھ جائے' تو ممکن ہے کہ ہم لوگ ٹیکسیوں میں دندنانے کی بجائے سڑکوں پر بھیک مانگتے نظر آئیں۔

بیروت کا شمار بھی دنیا کے ان مہذب شہروں میں ہے جہاں غریب ہونا تو کوئی جرم نہیں' البتہ بھیک مانگنا ضرور منع ہے۔ بندرگاہ کے باہر پولیس کا ایک سپاہی بید کی چھڑی گھما گھما کر بہت سے گداگروں کو منتشر کر رہا تھا جو سیاحوں پر بھوکی چیلوں کی طرح جھپٹتے تھے۔ فلسطینی مہاجروں کا ایک خاندان سپاہی کی نظر بچا کر ایک طرف سہما کھڑا تھا۔ ظاہراً وہ دست سوال دراز نہیں کر رہے تھے' لیکن ان کے چہرے اپنی بے زبانی سے پکار پکار کر ان کی بے بسی اور خستہ حالی کی فریاد کر رہے تھے۔

اس خاندان میں ایک چھ سات سال کا لڑکا تھا۔ ایک آٹھ نو سال کی لڑکی تھی اور ان کی ماں ایک ادھوری بہار کی طرح تھی' جسے وقت سے پہلے ہی خزاں نے پامال کر دیا ہو۔ وہ کبھی اپنے بچوں کی طرف دیکھتی تھی۔ کبھی راہگیروں کی طرف اور کبھی اس سپاہی کی طرف جو بید کی چھڑی گھما گھما کر بھیک منگوں کو بھگا رہا تھا۔

مجھے رکتا دیکھ کر وہ لڑکا میری طرف بڑھا اور بڑی لجاجت سے پوچھنے لگا۔ "کیا آپ ہماری تصویر کھینچنا چاہتے ہیں؟"

جس طرح ہمارے ہاں کے فقیر دیا سلائی یا بوٹ پالش کا سہارا لے کر بھیک مانگتے ہیں'

For more books visit www.4Urdu.com

اسی طرح فلسطین کے مہاجر تصویریں کھنچوا کر بخشش کی امید رکھتے ہیں۔ ان کے خوبصورت خدوخال' تیکھے تیکھے نقش اور اداس آنکھیں تصویر کشی کے لیے بڑے تابناک موضوع ہیں اور کیمرے والے سیاح ان کے فوٹو اتار کر بڑا فراخدلی سے بخشش دیتے ہیں۔

URDU4U.COM

تصویر کی فرمائش سن کر میرا جی چاہا کہ میں اس بچے کو اٹھا کر گلے سے لگا لوں اور کہوں کہ میرے معصوم فرشتے! ابھی خدا نے وہ مصور پیدا نہیں کیا جو تیری تصویر کا حق ادا کر سکے۔ تمہارے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ اس جھلستی ہوئی دھوپ میں تمہارے پاؤں ننگے ہیں اور تمہاری سہمی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی بھی خشک ہو چکی ہے۔ وہ تیری ماں ہے جسے قدرت نے شباب کی منزل سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا ہے اس کے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر شاید کوئی فریاد لرز رہی ہے' لیکن وہ سپاہی کے ڈر سے اپنا منہ نہیں کھول سکتی یا شاید اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ایک غضب ناک بددعا تڑپ رہی ہے جو اس نے صرف اس ڈر سے روکی ہوئی ہے کہ کہیں اس دنیا کا بھی وہی حشر نہ ہو جو نوح اور عاد اور ثمود کی بدنصیب اقوام کا ہوا تھا اور وہ تیری گڑیا سی بہن ہے جس نے ایک ہاتھ سے اپنی ماں کا دامن تھاما ہوا ہے۔ اور دوسرے ہاتھ سے وہ تمہیں واپس بلا رہی ہے تاکہ کوئی راہ گیر تمہیں زبردستی اٹھا کر اپنے ساتھ نہ لے جائے۔ اس ننھی سی معصوم بچی کے پاؤں بھی ننگے ہیں۔ اس کے کپڑوں میں بھی بہت سے سوراخ ہیں۔ اس کے سنہری بال ریشم کے الجھے ہوئے گچھوں کی طرح پریشان اور گھنگھریالے ہیں۔ ان خوبصورت بالوں میں ریت کے ذرے ابرق کی طرح چمک رہے ہیں۔ بچی کی پلکیں گھنی اور نوکدار ہیں اور اس کی اداس آنکھوں میں نیلی نیلی جھیلوں کی اتھاہ گہرائیاں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اگر یہ بچی آسمان پر پیدا ہوئی ہوتی' تو بے شک وہ جنت کی حور بنتی۔ لیکن وہ اس بے رحم زمین پر پیدا ہوئی' اور بنی آدم بنی اسرائیل کے ہاتھوں میں خدا کا یہ نادر شاہکار بھوک سے مرجھایا ہوا ہے' خوف سے سہما ہوا ہے' بے گھر ہے' بے سہارا ہے' اداس ہے۔ پامال ہے۔

For more books visit www.4Urdu.com

اس بچی کی جلد زیتون کے تیل کی طرح تا نہ اور شفاف ہے اس کی رگوں میں جو خون گردش کر رہا ہے۔ اس میں ڈھائی ہزار سال سے فلسطین کے چشموں کا پانی اور فلسطین کے پھولوں کی نکہت اور فلسطین کے انگوروں کا رس رچا ہوا ہے۔ اس لڑکی کے وجود میں یروشلم کی ان گنت پدیوں کے تقدس کی امانت پوشیدہ ہے۔ اس کی پرورش بڑے بڑے برگزیدہ پیغمبروں کے زیر سایہ ہوئی ہے۔ اس کی تربیت میں آسمانی صحیفوں کا ہاتھ ہے جو خدا نے اس برکت والی سرزمین پر نازل فرمائے۔ اس لڑکی کے آباؤ اجداد ڈھائی ہزار سال سے فلسطین کی خاک میں دفن ہو رہے ہیں' لیکن آج یہ لڑکی روٹی کے ایک ٹکڑے اور سہارے کی ایک جھونپڑی کے لیے ننگے پاؤں اور ننگے سر بیروت کی گلیوں میں پریشان حال ٹھوکریں کھا رہی ہے' کیونکہ بنی اسرائیل کی بھیڑوں کو ایک بار پھر وہ گھر یاد آنے لگا ہے جہاں سے ڈھائی ہزار سال قبل خدا نے انہیں نکال باہر کیا تھا۔

یہودیوں کا جدید ترین مقدس صحیفہ "اعلان بلفور" (Baffour Declaration) ہے' جو ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو برطانیہ کے دفتر خارجہ کی جانب سے نازل ہوا اور جس میں بشارت دی گئی تھی کہ شاہ انگلستان کی حکومت فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی گھر مہیا کرنے کے حق میں ہے اور اس سلسلے میں یہودیوں کی ہر ممکن مدد کرے گی۔

جس عقیدت مندی سے یہودی اس انسانی بشارت کی پیروی کر رہے ہیں۔ اگر اسی طرح انہوں نے اپنی الہامی کتاب تورات کو بھی مانا ہوتا تو شاید بنی اسرائیل کو ہزاروں سال تک دربدر کی خاک نہ چھاننا پڑتی۔

اے بنی اسرائیل! وہ دن یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیا جہان کے لوگوں پر فضیلت دی۔ جب خدا نے تمہیں قوم فرعون کے پنجے سے چھڑایا جو تمہیں بڑے بڑے دکھ دیتے تے۔ تمہارے لڑکوں پر تو چھری پھیرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو اپنی خدمت کے لیے زندہ رہنے دیتے تھے۔ جب خدا نے تمہارے لیے دریا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دی اور تم کو بچا کر فرعون کے آدمیوں کو تمہارے دیکھتے دیکھتے ڈبو دیا۔ جب خدا نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارا۔ جب موسیٰ نے اپنی لاٹھی پتھر پر ماری اور اس

For more books visit www.4Urdu.com

میں سے تمہارے لیے پانی کے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔

اے بنی اسرائیل! وہ دن بھی یاد کرو جب خدا نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم حق کے ساتھ باطل کو نہ ملانا اور خدا کی آیات کو سستے داموں نہ بیچنا' لیکن تم اس وعدہ کو وفا نہ کر پائے اور تم نے بڑی ہٹ دھرمی سے بچھڑے کو اپنا خدا بنا لیا۔ تم نے من و سلویٰ کی نعمت کو ٹھکرا کر ساگ پات اور ککڑی اور لہسن اور مسور اور پیاز کی فرمائش کی۔ اپنی اکڑ میں آ کر تم نے بعض پیغمبروں کو جھٹلایا اور بعض کو ناحق جان سے مار ڈالا اور خدا نے تمہاری نافرمانیوں کی پاداش میں کبھی تم کو خود اپنے ہاتھوں سے ایک دوسرے کو قتل کرنیکا حکم دیا۔ کبھی تم کو بجلی نے لے ڈالا۔ کبھی تم راندہ درگاہ ہو کر بندر بنا دیئے گئے۔ کبھی تمہارے سر پر طور کا پہاڑ لٹکا دیا گیا۔

اے بنی اسرائیل! بے شک تمہارے دل پتھر ہو گئے ہیں' بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ پتھروں میں بعض تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں اور بعض ہوتے ہیں کہ ان میں دراڑ پڑ جاتی ہے اور ان سے پانی رسنے لگتا ہے۔

اے بنی اسرائیل! آج تمہاری نسل بالکل اسی طرح مسخ ہو چکی ہے جس طرح کہ تم نے خدا کے کلام تورات کی شکل بدل ڈالی تھی۔ تمہاری رگوں میں جو لہو گردش کر رہا ہے' اس میں اسرائیلی خون کی آمیزش بہت ہی کم ہے۔ ہزاروں سال سے تم دنیا کے گوشے گوشے میں مارے مارے پھر رہے ہو اور تمہاری نسل دوسری قوموں میں غلط ملط ہو کر اب اپنی کوئی امتیازی حقیقت نہیں رکھتی۔ یوں بھی تم نے خدا کے رسولوں کی جگہ اب امریکہ اور انگلستان میں اپنی مرضی کے پیغمبر تلاش کر رکھے ہیں اور تمہاری موجودہ تورات "اعلان بالفور" ہے لیکن یاد رکھو' اس عرب بچی کا سہما ہوا دل اور اس کی غم دیدہ ماں کی دبی ہوئی آہ تمہارے سر پر کوہ طور سے بھی زیادہ خطرناک پہاڑ کی طرح لٹک رہا ہے۔ اس معصوم لڑکے کی نگاہ میں غضب ناک' قہرناک' زہرناک بجلیاں تڑپ رہی ہیں اور اگرچہ آج کل بندر بنانے کا رواج عام نہیں' لیکن خدا اپنے وعدہ

For more books visit www.4Urdu.com

کا سچا ہے۔ تم امریکہ اور انگلستان میں ڈھلے ہوئے سونے چاندی کے بچھڑوں کی جس قدر جی چاہے پوجا کر لو' لیکن عذاب کا جو طوق تمہاری گردن میں پڑا ہوا ہے' اس سے تمہیں نجات نہیں مل سکتی۔

URDU4U.COM

قاہرہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ مصر کی انقلابی حکومت نے حاجیوں کی آمد و رفت کے لیے نہایت اعلیٰ درجہ کے انتظامات کر رکھے ہیں۔ حاجیوں کو لے کر ہر روز دو ہوائی جہاز پرواز کرتے تھے۔ ہر تیسرے روز ایک سمندر جہاز بھی جدہ کے لیے روانہ ہوتا تھا۔ وزارت خارجہ کا جو افسر ان انتظامات کی دیکھ بھال پر مامور تھا۔ وہ میری درخواست دیکھ کر بڑا چیں بجبیں ہوا۔

"آپ پاکستانی ہو کر انگریزی میں درخواست کیوں لکھتے ہیں؟" اس نے میری جواب طلبی کی۔

میں نے معذرت کی کہ مجھے عربی نہیں آتی' اس لیے درخواست انگریزی میں لکھنا پڑی۔

"آپ کی اپنی زبان کیا ہے؟" افسر نے پوچھا۔

"اردو" میں نے جواب دیا۔

"پھر انگریز کے ساتھ آپ کا کیا رشتہ ہے؟" افسر نے طنزیہ پوچھا۔

میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ میں یہ تسلیم کروں کہ انگریزی کے ساتھ میرا فقط غلامی کا رشتہ ہے۔

میرا یہ اقبال جرم سن کر افسر مطمئن ہو گیا' اور بولا۔ "اس صورت میں بہتر یہی تھا کہ آپ اپنی درخواست اردو ہی میں لکھتے۔" پھر اس نے کچھ عرصہ تک ہر ملک کی قومی زبان کی اہمیت پر زور دیا۔ غلامی کے دور کی یادگاروں کی مذمت کی اور پھر انقلاب مصر کے حوالے سے عرب نیشنلزم کی فضیلت پر ایک دھواں دھار تقریر کی۔ اس کے بعد اس نے بڑی خندہ پیشانی سے مجھے ایک مصری جہاز "السوڈان" میں جدہ تک سفر کرنے کی اجازت دے دی۔

اگرچہ مصر کا علامتی صدر ابھی تک جنرل نجیب ہی تھا' لیکن ملک میں اصلی ڈنکہ جمال

For more books visit www.4Urdu.com

عبدالناصر کا بج رہا تھا۔ چاروں طرف عرب نیشنلزم کا تصور زور شور سے ابھر رہا تھا اور مختلف طبقات میں مختلف رنگ کے جذبات پیدا کر رہا تھا۔ اس کا ایک رنگ حاجی موسیٰ رضا کی دکان کا رنگ تھا۔ یہ دکان اندرون قاہرہ ایک بیحد تنگ اور گنجان بازار میں واقع تھی اس بازار میں چٹائیاں' پلنگ' جوتے' اچار' ہلدی' مرچ' شربت' کباب اور تربوزوں کی کٹی ہوئی قاشیں برسرعام دوش بدوش فروخت ہو رہی تھیں۔ حاجی موسیٰ رضا کی دکان میں یہ خصوصیت تھی کہ اس میں پھلوں اور سبزیوں کے علاوہ پرانی بوسیدہ کتابوں کے انبار تھے اور ایک کونے میں قدیم مصری نوادر کا مجموعہ بھی تھا۔ پھلوں میں ایک ٹوکری آموں کی تھی۔ میں نے پوچھا کہ یہ میوہ ہندوستان سے آیا ہے یا پاکستان سے؟

"جی نہیں۔" حاجی موسیٰ رضا نے برا منا کر کہا۔ "یہ پھل خاص مصر کی پیداوار ہے" اور پھر اس نے بڑی تفصیل سے مجھے باری باری وہ پھل اور سبزیاں دکھائیں جو وادی نیل کی خاص پیداوار ہیں۔ ان پھولوں اور سبزیوں میں انار بھی تھے۔ انگور بھی' آلو بھی اور لوکی اور چقندر بھی جس انداز سے حاجی موسیٰ رضا مجھے ان سے متعارف کرا رہا تھا' اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ اب اگر میں یہ کہوں کہ یہ اشیاء دنیا کی کسی اور زمین میں بھی پیدا ہوتی ہیں' تو حاجی موسیٰ رضا پھر برا منائے گا کہ میں آب نیل کی بے حرمتی کر رہا ہوں!

حاجی موسیٰ رضا کی دکان میں جو نوادرات تھے' وہ اکثر فرعونوں کے مقبروں سے نکلے ہوئے زیوروں' برتنوں' منقش پتھر کی سلوں وغیرہ پر مشتمل تھے حاجی صاحب کا بیٹا جو بیروت کی یونیورسٹی کا انڈر گریجویٹ تھا' بڑی فصاحت سے گاہکوں کو ان نوادرات کے حوالے سے مصر کی شاندار تہذیب کا پس منظر سنایا کرتا تھا۔ قاہرہ اور اسکندریہ کی بڑی بڑی دکانوں میں عورتوں کے ملبوسات کی بناوٹ اور زیورات کے نقش و نگار کا رجحان بھی زمانہ فراعین کے فیشنوں کی طرف مائل تھا اور تزئین و آرائش کے جملہ لوازمات صریحاً ان خطوط کی پیروی کر رہے تھے جو آج سے کئی ہزار سال پہلے مصر کی تہذیب و تمدن کا طرہ امتیاز تھے۔ اگر آپ مصر کی اصلی اندرونی زندگی دیکھنے کی خواہش کا اظہار کریں' تو قاہرہ

For more books visit www.4Urdu.com

کے سند یافتہ ٹورسٹ گائیڈ آپ کو ایک خاص ریستوران "عمر خیام" میں لے جائیں گے جو باہر سے قدرے غیر آباد نظر آتا ہے۔ اندر ایک چوکور کمرہ ہے جس کے دروازوں پر سرخ بانات کے پردے لٹک رہے ہیں دیواروں کے ساتھ ساتھ گاؤ تکیے لگے ہوئے ہیں اور فرشی نشستوں کے سامنے کھانا کھانے کے لیے لکڑی کی چھوٹی چھوٹی چوکیاں رکھی ہوئی ہیں۔ کمرے میں بیحد مدھم روشنی ہے اور دیواروں پر چاروں طرف فرعونی مقبروں کے اندرونی مناظر کی تصویریں اور علامتیں آویزاں ہیں۔ پردوں کے پیچھے کسی جگہ آرکسٹرا بج رہا ہے' جو نظر نہیں آتا اور اس کی دھن پر ایک لڑکی آپ کے سامنے طرح طرح کے بل کھا کھا کر ناچنے لگتی ہے۔ لڑکی کی کمر اور پنڈلیاں اور باہیں اور سینہ کھلا ہے اور اسکے باقی جسم پر جو باریک لباس ہے وہ پرانی تصویروں کے مطابق فرعونوں کے دربار کی رقاصائیں پہنا کرتی تھیں۔ ریستوران کے عملے میں سے ایک خوش پوش معزز نما انسان آپ کے پاس آ کے بیٹھ جائے گا اور سرگوشی کے انداز میں اس لڑکی کے ناچ پر محققانہ تبصرہ کرنے لگے گا کہ یہ ناچ کس فرعون کی محبوب رقاصہ کا خاص ناچ ہے اور اسے کتنے مقبروں کے اندرونی نقش و نگار کی تحقیق کے بعد ترتیب دیا گیا ہے۔

اگر آپ کے دل اور دماغ پر اس ناچ اور بصرے کا خاطر خواہ اثر ہو رہا ہے' تو یہ خوش پوش' معزز نما شخص بڑی رازداری سے اپنی جیب سے ایک البم نکال کر آپ کے ہاتھ سستے داموں فروخت کرنے کی پیش کش کرے گا۔ اس البم میں بہت سے فرعونوں کی جنسی عیش کوشی کے خفیہ راز پوشیدہ ہیں۔

تصویروں کے بعد یہ خوش پوش' معزز نما انسان آپ کو چند مقوی طلا اور تیل خریدنے کی ترغیب دے گا' جن کے نسخے تین تین ہزار سال پرانے مقبروں کے کتبوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔

چوڑیاں ہوں یا بندے' سبزیاں ہوں یا قدیم نوادر' جنسی تصویریں ہوں یا مقوی ادویات------ قاہرہ میں زندگی کا ہر رخ فرعونوں کی تہذیب سے رشتہ جوڑ کر فخر محسوس کرتا ہے۔

For more books visit www.4Urdu.com

یہاں پر نئی نسل کا ایک ایسا طبقہ بڑی سرعت سے نشوونما پا رہا ہے جس کا تصوری' فکری اور عملی مطمح نظر اس قدر شدید جذبہ قومیت ہے کہ اس کے سامنے دین کی حیثیت محض ذیلی اور ضمنی رہ جاتی ہے۔ اس مکتب خیال کی نظر میں مصر کی تہذیب کا اصلی ورثہ زمانہ فراعین کے آثار ہیں۔ اس تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں وہ اسلام کو ایک ثانوی سی تحریک شمار کرتے ہیں' جو تیرہ چودہ سو برس قبل اس سر زمین پر آئی اور اپنے ساتھ کئی دیر نقوش لائی۔ دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح مصر کے عوام بھی بڑے مخلص اور سیدھے سادھے مسلمان ہیں۔ یہ صرف نئی روشنی کے نوجوانوں کا ایک طبقہ ہے' جو نیشنلزم کی شدید رو میں بہہ کر اسلام کو اپنی قومیت کی بنیاد نہیں بناتا' بلکہ ہزاروں سال پہلے کے زمانہ کفر و ضلالت کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کر کے فخر و مباہات محسوس کرتا ہے فرازدنی اس طبقے کی منہ بولتی مثال ہے۔

فرازدنی سے میری ملاقات ایمسٹرڈم کے رائک میوزیم میں ہوئی تھی۔ وہ وہاں پر آثار قدیمہ کی بحالی' تجدید اور حفاظت کا فن سیکھنے آئی تھی اور اب مصر کے کسی ثقافتی ادارے میں بڑے اچھے عہدے پر فائز تھی۔ قاہرہ میں ایک روز اس نے مجھے اپنے ہاں چائے پر مدعو کیا۔ شہر کے جس حصہ میں اس کی رہائش تھی' اس کا نام امام شافعی تھا۔ اس علاقے میں اینٹوں اور سیمنٹ کے بے شمار پکے مکانات سلسلہ وار بنے ہوئے تھے' اور ان کی تعمیر میں ایک غیر معمولی یکسانیت نمایاں تھی۔ دیکھنے کو تو وہ رہائشی مکان نظر آتے تھے' لیکن یہ محلہ امیروں کا قبرستان تھا۔ قاہرہ کے کھاتے پیتے لوگ اپنے مردوں کو عوامی قبرستان میں دفن کرنے کے قائل نہیں ہیں جس طرح آج سے ہزاروں سال پہلے شاہان مصر اپنی قبروں پر بلند و بالا اہرام تعمیر کرتے تھے' اسی طرح قاہرہ کے امرا آج بھی اپنی لاشوں کی تدفین کے لیے پکے کمروں کا اہتمام کرتے ہیں۔ ہر خاندان کے لیے ایک الگ چار دیواری ہوتی ہے۔ اس کے اندر ایک کشادہ صحن ہے' جس کے نیچے دو زمین دوز کمرے ہوتے ہیں۔ ایک کمرہ مردانہ لاشوں کے کے مخصوص ہوتا ہے'

For more books visit www.4Urdu.com

دوسرا عورتوں کے لیے۔ جب کبھی کوئی نئی میت تیار ہوتی ہے' تو پرانے مردے کی ہڈیوں کو سمیٹ کر ایک کونے میں جمع کر دیا جاتا ہے اور نئی لاش کو ان تہہ خانوں میں لے جا کر ڈال دیتے ہیں۔ اس کے بعد تہہ خانوں کے دروازے کو بڑی بڑی سلوں کے ساتھ پاٹ دیا جاتا ہے اور جن سیڑھیوں کے ذریعہ ان زمین دوز کمروں میں اترا جاتا ہے۔ ان کے بالائی حصہ کو بھی پتھر کی سلوں سے بند کر دیا جاتا ہے۔ باہر صحن کے ایک کونے میں ایک باقاعدہ کمرہ بھی بنا ہوتا ہے۔ خاندان کے لوگ بعض تقاریب پر یہاں آ کر ٹھہرتے ہیں۔ فاتحہ درود پڑھا جاتا ہے۔ قرآن خوانی ہوتی ہے اور یوں بھی رات کے وقت شہر کی آبادی ان کمروں سے اور بھی کئی طرح کے کام لینا جانتی ہے۔

اس انوکھے شہر خموشاں سے گزر کر ایک تنگ گلی میں فرازدنی کا گھر تھا۔ گھر کی عمارت باہر سے کہنہ اور بوسیدہ تھی' لیکن اندر جا کر دیکھا تو کچھ اور ہی عالم پایا۔ فرازدنی کا اپنا کمرہ جدید ترین فرنیچر سے آراستہ تھا۔ دیواریں فرعونی مقبروں کے آثار' علامات اور نقوش سے بھری پڑی تھیں۔ ایک طرف مغربی موسیقی کے ساز اور بے شمار ریکارڈ جمع تھے۔ دوسری طرف ہوٹلوں کے بار روم کی طرح رنگ برنگ سیپیوں کی بنی ہوئی تپائی تھی' جس پر کئی قسم کی شراب کٹ گلاس کی خوبصورت صراحیوں میں سجی ہوئی تھی۔ تیسرے کونے میں زرد فارمیکا کی شفاف میز کے پیچھے بجلی کا ایک خوبصورت چھوٹا سا آٹومیٹک کچن تھا' سب سے پہلے فرازدنی نے میرے ساتھ اس بات پر گہری ہمدردی کا اظہار کیا کہ میں اس قدر گرم موسم میں خواہ مخواہ حج پر جانے کا خطرہ مول لے رہا ہوں۔ پھر اس نے اپنی دیواروں پر لگے ہوئے نقوش و نگار کی وضاحت کر کے فرعونی زمانوں کی تہذیبی و تمدنی عظمت پر طویل تقریر کی اور مسلمانوں کے دل میں فرعون کے خلاف جو بغض بھرا ہوا ہے' اس پر بڑی کڑی تنقید کی۔ اس کے بعد وہ بجلی کا چولہا جلا کر چائے بنانے میں مصروف ہو گئی اور مجھے حکم دیا کہ سینڈوچ بنانے کے لیے میں اس کی الماری سے اپنی پسند کی کوئی چیز نکال لوں۔ فرازدنی کا نعمت خانہ طرح طرح

For more books visit www.4Urdu.com

کے سامان سے لدا ہوا تھا' لیکن جتنے ڈبے میں نے اٹھائے۔ ان سب میں لحم خنزیر کا حصہ غالب تھا۔ اس لیے میں نے صرف خشک بسکٹوں کا ایک پکیٹ نکالا۔ میری اس حرکت پر وہ ہنسنے لگی' اور بولی۔ "مسلمان آپ ہی نہیں۔ میں بھی مسلمان ہوں' لیکن میں نے اپنے ذہن کو ان قیود سے آزاد کر لیا ہے جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔"

ترقی کی اس بے معنی منطق کے بعد فرازدنی مجھے اپنے باپ سے ملانے مکان کے ایک دوسرے حصے میں لے گئی۔ یہاں ایک اور طرفہ تماشا دیکھا۔ ایک نیم تاریک کمرے میں ساٹھ پینسٹھ سال کے ایک بزرگ گاؤ تکیہ لگائے قالین پر بیٹھے تھے۔ ان کا رنگ گندھے ہوئے میدے کی طرح سفید اور ملائم تھا۔ ان کی داڑھی سنہری اور فرنچ کٹ تھی اور ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اور سرخی جھلک رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ بہت سے اونچے اونچے گلدان تھے' جن میں نیم سوختہ اگربتیوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ دیواروں پر فلکیات کے نقشے اور اجرام فلکی کی تصاویر آویزاں تھیں۔ سامنے ایک تپائی پر بہت سے جنتریاں اور کچھ کرہ ارض کے گلوب اور چند اصطرلاب پڑے تھے۔ فرازدنی نے شکوہ کیا کہ اس کا باپ اس قدر قدامت پرست ہے کہ ابھی تک بابل اور ہاروت اور ماروت کے زمانے سے آگے نہیں بڑھا۔ عملیات اور جادوگری اس کا پیشہ تھا۔ مصر میں جادوگری خلاف قانون ہے۔ یہ صاحب دو بار جیل کی ہوا کھا چکے تھے۔ لیکن اب بھی صبح و شام حاجت مندوں کا ان کے ہاں تانتا بندھا رہتا تھا۔

فرازدنی کے والد بزرگوار نے بڑی خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا اور نہایت تپاک سے اپنے قریب بٹھایا۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ ان کے جادو ٹونے کی شہرت سن کر ایک نیا گاہک ان کے دام میں آیا ہے' لیکن جب فرازدنی نے انہیں آگاہ کیا کہ میں مفت کا ملاقاتی ہوں اور عنقریب حج پر جا رہا ہوں' تو اس مرد بزرگ کی گرمجوشی یک لخت سرد پڑ گئی اور انہوں نے بے اعتنائی سے منہ موڑ کر ایک جنتری کا مطالعہ شروع کر دیا۔

والد صاحب سے فارغ ہو کر فرازدنی مجھے اپنی والدہ کے پاس لے گئی' جو پچھلے برآمدے

For more books visit www.4Urdu.com

میں جاء نماز پر بیٹھی تسبیح کرنے میں مشغول تھی۔ فرازدنی نے جب اسے بتایا کہ میں حج پر جا رہا ہوں' تو اس بزرگ خاتون کی آنکھوں میں تیز تیز چمک آئی۔ جانماز سے اٹھ کر اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا' اور پھر ہاتھ اٹھا کر میرے لیے دعائے خیر کی۔

قاہرہ کے اس گھر کی ایک چھت کے نیچے زندگی کے تین دھارے بہہ رہے تھے۔ ایک طرف صاحب خانہ تھا' جو فلکیات' عملیات اور قدیم ساحری کی بھول بھلیوں میں مال و دولت کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ دوسری طرف اس کی فیشن ایبل بیٹی تھی جو پرانی کافرانہ تہذیب کے مردہ خانوں میں نئی روشنی کے چراغ لے کر لذت پرستی کے ظلمت کدوں میں بھٹک رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان فرازدنی کی بے زبان ماں تھی جو اپنی جانماز پر اللہ کی رسی مضبوطی سے تھامے بیٹھی تھی۔

بڑے بڑے اولوالعزم پیغمبروں اور ظالم اور سرکش فرعونوں کی اس سر زمین پر خیر و شر کی قوتیں عجیب و غریب روپ دھار کر نت نئے انداز سے ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں تھیں' لیکن سچ تو ہے کہ مصر کے سواد اعظم کا دل اور دماغ اسلام کے رشتے میں اسی طرح پرویا ہوا ہے جس طرح کہ دنیا کے اور مسلمانوں کا' اس کا روح پرور نظارہ میں نے حاجیوں کے جہاز "السوڈان" میں دیکھا۔

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• سرابِ منزل

جس وقت "السوڈان" نے اسماعیلیہ کی بندگاہ سے لنگر اٹھایا' اس میں ساڑھے سات سو عازمین حج سوار تھے۔ اس سارے قافلے میں فقط میں ایک غیر مصری مسافر تھا۔ میرے پاس ڈیک (Deck) پر سفر کرنے کا ٹکٹ تھا۔

URDU4U.COM

جہاز چلتے ہی مائیکروفون پر اعلان ہوا کہ پاکستانی مسافر بالائی عرشہ پر کپتان سے آ کر ملے۔ ایک سٹیوارڈ میری رہنمائی کر کے اوپر لے گیا۔ جہاز کا کپتان نہایت چاق و چوبند نوجوان تھا اور بڑی روانی سے شستہ انگریزی بولتا تھا۔ اس نے میرے پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات کا معائنہ کیا اور پھر قہوہ پلا کر پاکستان میں میری ملازمت کی نوعیت کے متعلق کچھ سوالات کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنے عملے کے ایک آدمی کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ مجھے ساتھ لے جا کر محمد نوفل کے کیبن میں برتھ دلوا دے۔

محمد نوفل اسکندریہ کے بہت بڑے تاجر' صنعت کار اور رئیس تھے۔ وہ دس برس سے ہر سال متواتر حج پر جا رہے تھے۔ دو برتھ کا پورا کیبن انہوں نے اپنے لیے ریزرو کروایا ہوا تھا۔ ایک برتھ پر وہ خود بیٹھے تھے۔ دوسرے برتھ پر ان کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ جہاز کے ملازم نے عربی میں انہیں کچھ کہا اور نوفل صاحب نے اہلاً و سہلاً کہہ کر بڑی خوش دلی سے اپنا سامان اٹھا کر دوسرا برتھ میرے لیے خالی کر دیا۔

نوفل صاحب کی رفاقت میرے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ وہ بڑی اچھی انگریزی بولتے تھے اور مناسک حج کے متعلق مجھے ان سے نہایت مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ پاکستان کے متعلق وہ زیادہ نہ جانتے تھے۔ شام کو مغرب کی نماز کے بعد انہوں نے بہت سے لوگوں کو اپنے ڈیک پر جمع کیا' اور فرمائش کی کہ میں انہیں پاکستان کے متعلق کچھ باتیں بتاؤں۔ جہاز کا کپتان اور اس کے عملے کے کچھ افراد بھی وہاں آ کر بیٹھ گئے۔ کوئی گھنٹہ بھر میں نے انہیں تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کے چیدہ چیدہ واقعات سنائے۔

For more books visit www.4Urdu.com

میں انگریزی میں ٹھہر ٹھہر کر بولتا تھا اور نوفل صاحب اس کا عربی میں ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ آزادی کے وقت لاکھوں مسلمانوں کی شہادت' عورتوں کی بے حرمتی اور مہاجرین کے حالات سن کر سب کو بڑی حیرت ہوئی۔ جب میں نے انہیں پاکستان کی آبادی' رقبہ اور دیگر تفصیلات بتانے کے بعد یہ کہا کہ دنیا کی اس پانچویں بڑی مملکت کا نصب العین یہی ہے کہ: "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ" تو سارے مجمع نے بے ساختہ کلمہ طیبہ کا ورد کیا اور پھر سب نے کھڑے ہو کر پاکستان کے حق میں دعا مانگی۔ محمد نوفل صاحب بلند آواز سے دعا کے الفاظ بولتے تھے اور باقی سب لوگ زور زور سے آمین آمین کہتے تھے۔ اس کے بعد کپتان نے قہوہ کا آرڈر دیا۔ یکے بعد دیگرے بہت سے لوگوں نے مجھے قہوے کے اتنے فنجان پلائے کہ اس کی حدت سے مجھے رات بھر کئی بار نکسیر پھوٹی۔

یوں بھی بحر احمر میں گرمی اپنے پورے شباب پر تھی۔ سمندر کی لہریں جہاز سے ٹکراتی تھیں تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہمارے چاروں طرف بڑی دیگوں میں ابلتا ہوا پانی جوش کھا رہا ہے۔ ہوا بھاپ کی طرح گدلی گدلی سی تھی اور فضا کا سارا ماحول گرم پانی میں بھیگے ہوئے کمبلوں میں لپٹا ہوا تھا۔ دن بھر کیبن کی کھڑکی سے ہوا کے جھونکے کھولتے ہوئے پانی کے پرنالوں کی طرح اندر گرتے تھے۔ رات کو پورٹ ہول کی ہوا نیم گرم بخارات کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ کچھ کمروں میں بجلی کے پنکھے لگے ہوئے تھے' لیکن ان کی گردش رطوبت سے لدی ہوئی بوجھل ہوا کو اپنی جگہ سے ہلانے سے قاصر تھی۔ دھوپ میں آفتاب کی کرنیں لوہے کی گرم گرم سلاخوں کی طرح لٹک رہی تھیں اور جہاز کے ہر مسافر کا چہرہ پسینے کی جھالر میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے باوجود عازمین حج کی ٹولیاں بڑے اطمینان سے عرشے پر جابجا بیٹھی تھیں۔ کچھ لوگ تلاوت قرآن میں مصروف تھے۔ کچھ تسبیح کر رہے تھے۔ کچھ حج کی دعائیں یاد کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں محمد نوفل صاحب بھی کرسی پر بیٹھے تھے اور کٹی ہوئی برف کی

For more books visit www.4Urdu.com

پوٹلی بار بار سر پر پھیر رہے تھے۔

دھوپ میں اطمینان سے بیٹھے ہوئے عازمین حج کی طرف دیکھ کر محمد نوفل نے سرد آہ بھری اور کہا۔ "میں بھی ان لوگوں کا ہم وطن ہوں' لیکن ہمارے درمیان ایک بہت بڑا فرق ہے۔ یہ غریب لوگ ہیں۔ ان کے سینے میں قناعت کی اتنی خنکی ہے کہ گرم موسم کی شدت ان پر کوئی اثر نہیں کرتی۔ میرا معاملہ دوسرا ہے۔ میں بڑا کامیاب تاجر اور صنعتکار ہوں۔ میں جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں اس پر ہن برسنے لگتا ہے' لیکن میرا دل نہیں بھرتا میرے اندر ہر وقت حرص کی بھٹی سلگتی رہتی ہے۔ سردی کے موسم میں بھی برف کے بغیر میری پیاس نہیں بجھتی۔"

میں نے اسے ایک بزرگ کا مقولہ سنایا کہ دنیا کی مثال آدمی کے سایہ کی سی ہے اگر کوئی اپنے سایہ کی طرف دوڑے تو وہ اس کے آگے ہی آگے بھاگتا نظر آئے گا اور اگر سایہ کو پس پشت ڈالے تو وہ خود اس کا پیچھا نہ چھوڑے۔ جو کوئی دنیا کو ترک کرتا ہے دنیا اس کا پیچھا کرتی ہے اور ترک کرنے والے کو تلاش کرتی ہے اور جو کوئی طلب دنیا میں کوشش کرتا ہے' اسے للچا للچا کر کوسوں دور بھاگتی ہے۔

محمد نوفل نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا۔ "میرے لیے دونوں حالتیں یکساں ہیں۔ میں دنیا کے پیچھے بھاگوں یا دنیا میرے پیچھے بھاگے۔ دونوں صورتوں میں حرص کی آگ میرے تن من میں بدستور بھڑکتی رہتی ہے۔

محمد نوفل کا یہ دسواں حج تھا۔ ہر سال حج کے موقع پر وہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں لاکھوں ریال کی خیرات بانٹ کر آتے تھے۔ "لیکن" انہوں نے بڑی حسرت سے کہا: "حضوری کی جو کیفیت مجھے پہلے حج میں حاصل ہوئی تھی۔ وہ بعد میں کبھی نصیب نہیں ہوئی اس وقت میں بالکل غریب تھا اور میرے پاس معلم کی فیس ادا کرنے کے لیے بھی پوری رقم موجود نہ تھی۔ اب ریالوں سے بھرے ہوئے تھیلے مجھے اپنے حضور میں حاضر رکھتے ہیں۔ طواف کے دوران بھی اللہ تعالیٰ کا گھر مجھ سے ہزاروں میل دور رہتا ہے۔"

For more books visit www.4Urdu.com

اس قسم کی باتیں کرتے کرتے محمد نوفل کی چیخ نکل گئی اور وہ بے اختیار دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ رونے کی آواز سن کر بہت سے عازمین حج وہاں جمع ہو گئے۔ اپنے ملک کے اتنے بڑے رئیس پر گریہ و زادی کا یہ عالم دیکھ کر ان پر بھی رقت طاری ہو گئی اور وہ بڑے خضوع و خشوع سے باآواز بلند کلمہ طیبہ کا ورد کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ذکر کا یہ حلقہ پھیلتا گیا اور سارے عرشہ پر تل دھرنے کو جگہ باقی نہ رہی۔

اگلے روز نماز عشاء کے بعد اعلان ہوا کہ رات کے ساڑھے گیارہ بجے جہاز میقات حرم سے گزرے گا۔ اس لیے سب لوگ احرام باندھنے کی تیاری کر لیں۔ یہ اعلان سنتے ہی مسافروں میں بجلی کی رو دوڑ گئی اور سب لوگ احرام کی تیاریوں میں منہمک ہو گئے۔ ان میں بڈھے بھی تھے جوان بھی تھے' عورتیں بھی تھیں' مرد بھی تھے اور ان سب کے ذوق و شوق میں پیا ملن کی آس رنگین پچکاریوں کی طرح سارے جہاز کو شرابور کر رہی تھی۔ ساڑھے گیارہ بجے تک سب مسافر احرام باندھ کر جہاز کے عرشوں پر جمع ہو گئے۔ گیارہ بج کر چالیس منٹ پر جہاز کا سائرن بجا اور ساڑھے سات سو حاجیوں نے بیک زبان تلبیہ کا آوازہ بلند کیا۔

لبیک اللھم لبیک۔ لبیک لاشریک لک لبیک۔ ان الحمد و النعمہ۔

اے اللہ میں تیرے دربار میں حاضر ہو گیا۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ تحقیق ہر طرح کی تعریف اور نعمت

لک والملک لا شریک لک۔

تیرے لیے ہے اور ملک تیرے لیے ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔

تلبیہ کا نعرہ لگاتے ہی ساڑھے سات سو افراد کا یہ مجمع چشم زدن میں خالق کائنات کے حضور میں جا کھڑا ہوا۔ اس مجمع میں پاکباز بھی تھے' گناہگار بھی تھے۔ ہوسکار بھی تھے قناعت شعار بھی تھے' خوش اخلاق بھی تھے' ریاکار بھی تھے۔ عبادت گزار بھی تھے۔ غفلت کا شکار بھی تھے' لیکن اس وقت وہ سب بلا کسی امتیاز کے ایک ہی وردی میں ملبوس

For more books visit www.4Urdu.com

ایک ہی قطار میں کھڑے ہوئے' ایک ہی کلمہ پڑھتے ہوئے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں بیک وقت حاضر تھے' کسی فرشتے نے ان کے لیے رسائی کا دروازہ نہ کھولا تھا۔ کوئی ابلیس ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بنا تھا۔ وہ تو بس اپنے رسول کے بتائے ہوئے چند کلمات زبان پر لاتے ہی کھٹ سے اس بادشاہ کے دربار میں پہنچ گئے تھے جس کا کوئی ثانی ہے نہ شریک۔ جس کے پھاٹک پر نہ کوئی پہرہ ہے نہ دربان' نہ اے ڈی سی ہے' نہ پی اے ہے' نہ سیکرٹری ہے' نہ ملٹری سیکرٹری ہے۔ رات کے سناٹے میں تلبیہ کی گونج کالی گھٹاؤں میں بجلی کی چمک کی طرح کوندتی تھی۔ جہاز کے انجن کی چھک چھک اور سمندر کی لہروں کی شاں شاں کسی کو سنائی نہ دیتی تھی۔ بحرا احمر کا پانی کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ آسمان کے تارے بھی سب کی آنکھوں سے اوجھل تھے۔ ساری کائنات ایک خلا بن گئی تھی جس میں عبد اور معبود کے علاوہ اور کسی کا وجود باقی نہ رہا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے "السوڈان" جدہ کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہو گیا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس مقدس سرزمین پر سر کے بل اتروں' لیکن میرے ہاتھوں میں سامان اور سر پر گناہوں کی گٹھڑی تھی اس لیے اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہا۔ کسٹم ہاؤس کے آس پاس بہت سے معلموں کے وکیل اپنا اپنا دفتر لگائے بیٹھے تھے ایک جگہ عبدالرزاق محبوب معلم کا بورڈ لٹکا ہوا تھا اور اس کے اردگرد سہلٹ کے بہت سے بنگالی زائرین جمع تھے۔ معلم کا وکیل حساب لگا کر انہیں چیخ چیخ کر سمجھا رہا تھا کہ جس کے پاس تین سو پچاسی ریال کی رقم موجود نہیں' وہ نہ حج کے اخراجات پورے کر سکتا ہے اور نہ مدینہ منورہ کی زیارت سے فیض یاب ہو سکتا ہے جو شخص اسے پوری رقم گن کر دکھا دیتا تھا وکیل اس کا نام معلم کے رجسٹر میں درج کر لیتا تھا۔ میں نے بھی تین سو پچاسی ریال نقد دکھا کر عبدالرزاق محبوب کو اپنا معلم مقرر کر لیا۔ اس وقت میرے پاس بارہ سو ریال کی رقم موجود تھی۔ اس میں تین سو پچاسی ریال اپنے لیے رکھ کر باقی آٹھ سو پندرہ ریال میں نے چپکے سے شاکر میاں اور تفضل علی میں برابر بانٹ

For more books visit www.4Urdu.com

دیئے' جو خالی ہاتھ تھے اور معلم کے وکیل نے انہیں اپنے رجسٹر میں درج کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ شاکر میاں اور تفضل علی نے سمجھا کہ گرمی کی شدت سے میرا دماغ چل گیا ہے اور میں یہ حرکت دماغی توازن خراب ہو جانے کی وجہ سے کر رہا ہوں۔ انہوں نے یہ ساری بات معلم کے وکیل کو بتائی وکیل نے بھی اس بات کی تائید کی کہ گرمی نے میرے دماغ میں خلل ڈالا ہوا ہے۔ جب میں نے بہت اصرار کیا' تو وہ مجھے کسٹم ہاؤس کی پولیس چوکی میں لے گئے۔ ہم سب کے بیانات سن کر پولیس والوں نے حکم دیا کہ یہ رقم معلم کا وکیل اپنے پاس امانت رکھے۔ اگر چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد بھی میں اقرار کروں کہ میں یہ پیسے بقائمی ہوش و حواس شاکر میاں اور تفضل علی کو دے رہا ہوں' تو بے شک ان کو ادا کر دیئے جائیں۔

جدہ کے حاجی کیمپ میں ہمارے معلم نے اپنی اسامیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک طبقہ تو آسودہ حال حاجیوں کا تھا جو معلم کی فیس کے علاوہ مکہ معظمہ میں اس سے رہائشی کمرے کرائے پر لینے کی توفیق بھی رکھتے تھے۔ دوسرا طبقہ ہمارے جیسے تین سو پچاسی ریال والوں کا تھا جو بڑی مشکل سے صرف ضروری واجبات ادا کرنے کی پوزیشن میں تھے جدہ سے مکہ کو روانگی کے وقت پہلے طبقہ کو بسوں کے اندر سیٹوں پر بٹھایا جاتا تھا' اور ہمیں چھت پر جگہ ملتی تھی۔

ہماری بس آدھی رات کے قریب مکہ معظمہ میں داخل ہوئی۔ معلم عبدالرزاق محبوب کا بارہ تیرہ برس کا بیٹا ہمارے گروپ کو ایک گندے نالے کے کنارے لے گیا اور تیس پینتیس گز زمین گھیر کر اسے ہماری اقامت گاہ قرار دے دیا۔ کچھ لوگ چادریں بچھا کر لیٹنے لگے' تو معلم کے بیٹے نے ڈانٹا کہ یہ پاؤں پسار کر سونے کا وقت نہیں' بلکہ ہم وضو کر کے تیار ہو جائیں' کیونکہ وہ تھوڑی دیر میں واپس آ کر ہمیں عمرہ کرانے لے جائے گا۔ ہم نے بھاگ دوڑ کر کسی نہ کسی طرح وضو کیا اور معلم کے بیٹے کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ وہ برخودار ڈھائی تین گھنٹے کے بعد نمودار ہوا اور ہم بیس پچیس

For more books visit www.4Urdu.com

آدمی اس کی رہنمائی میں تلبیہ پڑھتے ہوئے بیت اللہ شریف کی طرف روانہ ہو گئے۔

میں نے سن رکھا تھا کہ جو شخص حرم شریف میں داخل ہوتا ہے' وہ اپنا جوتا' اپنے گناہوں کی گٹھڑی' اپنی دستار فضیلت اور اپنی بزرگی کا عمامہ دروازے کے باہر چھوڑ جاتا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جب وہ باہر آئے گا تو اس کا جوتا' یا اس کے گناہوں کی گٹھڑی' یا اس کی فضیلت کی دستار' یا اس کی بزرگی کا عمامہ اس کو واپس بھی ملے گا یا نہیں۔ بعض لوگوں کے جوتے گم ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کے گناہوں کی گٹھڑیاں غائب ہو جاتی ہیں۔ بعض لوگ اپنی فضیلت اور بزرگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔

میرے پاس حرم شریف کے باہر چھوڑنے کے لیے اپنے پاؤں میں ربڑ کے چپل اور سر پر گناہوں کی گٹھڑی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ میں نے دل و جان سے دونوں کو اٹھا کر باہر پھینک مارا اور باب السلام کے راستے حرم شریف میں داخل ہو گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی دم بھر کے لیے بجلی سی کوندی اور زمین کی کشش ثقل گویا ختم ہو گئی۔

مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے گاڑی کو مضبوط بریک لگا کر میرے وجود کو پنکچر شدہ ٹائر کی طرح جیک لگا کر ہوا میں معلق کر دیا گیا ہو' جیسے میری پنڈلیوں کا گوشت ہڈیوں سے الگ ہو رہا ہو' میرے جسم کے اعضا کا ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ ٹوٹ سا گیا۔ ہاتھ بے لوچ ہو کر لٹک سے گئے اور سر بھنور میں پھنسے ہوئے خس و خاشاک کی طرح بے بسی سے چکر کاٹنے لگا۔ اس طرح اپاہج سا ہو کر میں طواف کے لیے آگے بڑھنے کی بجائے بے ساختہ لڑکھڑا کر وہیں بیٹھ گیا۔

نماز فجر کے بعد ہمارے معلم کا بیٹا حاجیوں کی ایک اور پارٹی کو عمرہ کرانے میرے قریب سے گزرا۔ ان کے ساتھ شامل ہونے کو جی تو چاہا' لیکن ہمت نہ ہوئی۔ میرے قریب ہی چند قدم کے فاصلے پر قرآن مجید کی تلاوت ہو رہی تھی۔ میں نے بھی قرآن شریف کی ایک جلد اٹھائی اور ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر تلاوت شروع کر دی۔ ابھی چند سطریں ہی پڑھ پایا تھا کہ مجھے نیند کے سخت جھونکے آنے لگے جیسے کسی نے کلوروفارم

For more books visit www.4Urdu.com

سنگھا دیا ہو۔ اب یہ روگ جان کو لاگو ہو گیا کہ ویسے تو میں بالکل چوکس و بیدار رہتا تھا لیکن قرآن شریف کھولتے ہی آنکھیں نیند کے خمار سے بے اختیار بند ہونے لگتی تھیں۔ کچھ دیر اس کشمکش کی اذیت جھیلنے کے بعد میں اٹھا اور باہر آ کر ڈھونڈتا ڈھونڈتا بڑی مشکل سے اپنی جائے قیام پر واپس پہنچا۔ میرے کچھ ساتھی عمرہ کرنے کے بعد احرام کھول کر آرام سے سو رہے تھے۔ باقی زمین پر بیٹھے بیڑی پی رہے تھے۔ میں نے ان سے بیت الخلا کے متعلق دریافت کیا' تو انہوں نے ایک جانب اشارہ کر کے کہا کہ نالے کے ساتھ ساتھ سیدھے چلتے جاؤ۔ پندرہ بیس منٹ میں بیت الخلا پہنچ جاؤ گے۔

کوئی نصف میل چلنے کے بعد ایک کچی چار دیواری آئی۔ اس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے دروازے بنے ہوئے تھے۔ ہر دروازے کے سامنے لوگوں کی طویل قطار ہاتھوں میں لوٹے لیے منتظر کھڑی تھی۔ ایک شخص نے چند قرش لے کر مجھے بھی پانی سے بھرا ہوا لوٹا دے دیا جسے سنبھال کر میں بھی ایک قطار میں لگ گیا۔ کافی دیر کے بعد میری باری آئی۔ میں اندر گیا' تو قدمچے کے اوپر تک بول و براز کا ڈھیر تیر رہا تھا۔ اندر جاتے ہی مجھے اس قدر زور کی قے آئی کہ میں پھسل کر پاخانے کی اس دلدل میں گر گیا۔ کمر سے اوپر تک میرا بدن اور احرام غلاظت سے بھر گیا اور میں اسی طرح بدبو اور تعفن میں شرابور نالے کے کنارے واپس پہنچا۔

راستے میں جو کوئی میرے قریب سے گزرتا تھا وہ فوراً گھن کھا کر ناک پر ہاتھ یا کپڑا رکھ لیتا تھا۔ میرے ساتھی بھی میری اس ہیئت کذائی پر خوب ہنسے اور چھی چھی کر کے مجھے اپنی جگہ سے دور بٹھا دیا۔ میرے پاس دوسرا احرام نہ تھا۔ میں نے ایک بنگالی ساتھی سے لنگی مانگی اور اسے باندھ کر احرام دھویا اور غسل کیا۔ ظہر کی نماز تک نہا دھو کر میں نے پھر حرم شریف کی راہ لی۔ اب میرے ظاہر سے تو کسی کو بدبو نہ آ رہی تھی' لیکن اپنے اندر کے تعفن سے میرا دماغ بری طرح پھٹ رہا تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ حج کے ایام مین تین سو ساٹھ اولیاء اللہ ہر وقت حرم شریف میں

For more books visit www.4Urdu.com

حاضر رہتے ہیں۔ میں نے حطیم میں کھڑے ہو کر زور زور سے پکارنا شروع کر دیا کہ آپ لوگ جو تین سو ساٹھ کی تعداد میں یہاں پر فوج در فوج موجود ہیں' آخر آپ کس مرض کی دوا ہیں؟ میرے پاؤں میں زنجیر پڑی ہوئی ہے اور میں اب تک عمرہ ادا نہیں کر سکا۔ میری آنکھوں میں نیند کا خمار چھایا رہتا ہے اور میں قرآن شریف کی تلاوت سے معذور ہوں کیا آپ حضرات کے پاس ایسے مریض کا کوئی علاج نہیں ہے؟

میرا خیال تھا کہ میری پکار سن کر حرم شریف کے چاروں کونوں سے نورانی صورت والے خرقہ پوش بزرگ بھاگتے ہوئے آئیں گے اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے میری مشکل سے نجات دلوائیں گے' لیکن ایسا کوئی واقعہ رونما نہ ہوا۔ البتہ اس کے بعد رفتہ رفتہ میرے پاؤں طواف کے لیے آزاد ہو گئے اور میری آنکھوں میں تلاوت کے لیے بیداری آ گئی۔

نالے کے کنارے میرے بالکل قریب بہاول پور کے ایک خاندان نے ڈیرا لگایا ہوا تھا۔ ایک بوڑھے میاں بیوی کے ساتھ ان کی جوان بہو تھی۔ بڑے میاں تو خاموش بیٹھے حقہ پیتے رہتے تھے' لیکن ساس اور بہو میں بات بات پر بڑی طویل لڑائی ہوا کرتی تھی۔ لڑائی میں ہار اکثر بہو کی ہوتی تھی اور ہر شکست کے بعد وہ روتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوتی تھی اور ساس سے کہتی تھی۔ "اچھا' تم نے جتنا ظلم کرنا ہے مجھ پر کر لو۔ میں بھی ابھی جا کر طواف کرتی ہوں اور اللہ میاں کے پاس اپنی فریاد پہنچاتی ہوں۔"

یہ دھمکی سنتے ہی اس کی ساس فوراً پسیج جاتی تھی اور بہو کا دامن پکڑ کر بری لجاجت سے کہتی تھی۔ "نہ بیٹی نہ۔ تو تو میری بیٹی ہے۔ ایسی غلطی نہ کرنا۔ خواہ مخواہ کوئی الٹی سیدھی بات منہ سے نہ نکال بیٹھنا۔ طواف میں جو منہ سے نکل جائے وہ پورا ہو کے رہتا ہے۔"

یہ ڈرامہ رات دن میں کئی بار ہوتا تھا۔ ایک روز بڑی شدید گرمی تھی۔ دوپہر کے وقت اچانک آندھی آئی اور خوب تیز بارش ہونے لگی۔ نالے کے کنارے مقیم حاجیوں کا سامان کیچڑ میں لت پت ہو گیا۔ اب ساس بہو میں بڑی سخت چیخ چیخ ہونے لگی۔ غصے

For more books visit www.4Urdu.com

میں آ کر ساس نے بہو کو چوٹی سے پکڑ لیا اور اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہنے لگی۔ "آج صبح طواف میں یہ حرام زادی کہہ رہی تھی۔ اللہ میاں بڑی گرمی ہے۔ اللہ میاں بڑی گرمی ہے۔ اللہ میاں بارش' اللہ میاں بارش۔ اری کالے منہ والی' تمہیں پتہ نہیں یہاں ہر دعا قبول ہو جاتی ہے؟ لے اب بارش کا مزا چکھ۔ اب یہ سامان تیرا باپ آ کے سکھائے گا۔

اس خاندان سے ذرا ہٹ کر ایک جوان جوڑے کا بسیرا تھا۔ یہ میاں بیوی بے اولاد تھے اور بچے کی آرزو لے کر حج کرنے آئے تھے۔ اپنا پہلا طواف کر کے یہ واپس آئے تو بیوی نے بڑے وثوق سے کہا کہ اب ان کی مراد ضرور پوری ہو جائے گی' کیونکہ طواف کے دوران اس نے اللہ تعالیٰ سے بچہ کے علاوہ اور کچھ نہیں مانگا۔

"لڑکا مانگا تھا یا صرف بچہ مانگا تھا؟" خاوند نے وکیلوں کی طرح جرح کی۔

"لڑکے کی بات تو میں نے کوئی نہیں کی۔ فقط بچہ مانگنے کی دعا کرتی رہی۔" بیوی نے جواب دیا۔

"رہی نہ اوت کی اوت۔" خاوند نے بگڑ کر کہا۔ "اب اللہ کی مرضی ہے' چاہے تو لڑکا دے' چاہے تو لڑکی دے۔ اب وہ تجھ سے پوچھنے تھوڑی آئے گا۔ اس وقت لڑکے کی شرط لگا دیتی تو لڑکا ہی ملتا۔ یہاں کی دعا کبھی نامنظور نہیں ہوتی۔"

یہ سن کر بیچاری بیوی بھی کف افسوس ملنے لگی۔ پھر چہک کر بولی۔ "کوئی بات نہیں۔ تم کچھ فکر نہ کرو۔ ابھی بہت سے طواف باقی ہیں۔ اگلی بار میں اپنے خداوند کو لڑکے کے لیے راضی کر لوں گی۔"

ان سیدھے سادھے مسلمانوں کا ایمان اس قدر راسخ تھا کہ خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے ہی وہ کوہ طور کی چوٹی پر پہنچ جاتے تھے اور اپنے معبود حقیقی سے راز و نیاز کر کے نفس مطمئنہ کا انعام پاتے تھے۔ ان سب کو حق الیقین کی دولت حاصل تھی اور وہ بڑی بے تکلفی سے اپنی اپنی فرمائشیں رب کعبہ کے حضور پیش کر کے کھٹا کھٹ قبولیت کی مہر لگوا لیتے تھے۔ ان کے مقابلے میں مجھے اپنی نمازیں' اپنے طواف اور اپنی ادائیں بے

For more books visit www.4Urdu.com

حد سطحی اور کھوکھلی اور بے جان اور جعلی اور نقلی اور فرضی نظر آنے لگیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ مین اس لڑاکا ساس اور بہو اور اس نوجوان کی بے اولاد بیوی کے پاؤں کی خاک تبرک کے طور پر اپنے سر پر ڈالوں' تاکہ کسی طرح مجھے بھی ان کے یقین محکم کا ایک چھوٹا سا ذرہ نصیب ہو۔

منیٰ کے لیے روانگی مقرر ہوتے ہی مجھے شدید لرزہ کے ساتھ بخار آنے لگا اور ساتھ ہی بڑے زور کی نکسیر چلنے لگی۔ میری علالت کی خبر سن کر معلم عبدالرزاق محبوب بنفس نفیس نالے کے کنارے آیا اور میری نبض دیکھ کر بولا کہ منیٰ اور عرفات میں بڑی سخت گرمی ہو گی۔ اس حالت میں وہ مجھے اپنے ساتھ ہرگز نہیں لے جا سکتا۔ دوسرے حاجیوں کو اس نے تاکید کی کہ نماز فجر کے فوراً بعد وہ بس پر سوار ہونے کے لیے اس کے ڈیرہ کے سامنے جمع ہو جائیں۔ معلم کا حکم سن کر میرے بعض ساتھیوں نے میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ بعض نے تسلی دی کہ کوئی بات نہیں۔ زندگی رہی تو انشاء اللہ حج پھر کبھی نصیب ہو جائے گا۔ بعض نے تاسفانہ سر ہلایا اور خاموش رہے' لیکن بہاول پوری بہو کی لڑاکا ساس کڑک کر بولی۔ "تم جوان آدمی ہو۔ یہاں ڈھیری ڈھا کر لمبے کیوں پڑے ہو؟ جاؤ' اٹھ کر طواف کرو۔ اللہ میاں یہاں تک لایا ہے تو اب خالی ہاتھ واپس بھیجتے اسے شرم نہ آئے گی؟"

میں اٹھ کر چلنے لگا' تو چلا نہ جاتا تھا۔ نقاہت کے مارے میرا برا حال تھا۔ یہ دیکھ کر اس بے اولاد بیوی کا جواں سال میاں اٹھ کر آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ "آؤ میں تمہیں طوف کرا لاتا ہوں۔"

مطاف میں بڑا ہجوم تھا' لیکن اس نوجوان نے بڑی محنت سے سہارا دیکر مجھے طواف کرایا۔ ساتھ ہی بلند آواز سے میرے لیے دعا مانگتا جاتا تھا۔ اس دعا اور طواف نے میری ہمت بندھائی اور اس کے بعد میں نے خود ہی کئی طواف اور بھی کئے۔ صبح سویرے میں بھی تا زہ دم تھا اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ معلم صاحب کے ڈیرے جا پہنچا۔ وہاں

For more books visit www.4Urdu.com

پر صرف ایک بس کھڑی تھی جو سواریوں سے اٹا اٹ بھری ہوئی تھی۔ چھت پر بھی لوگ سوار تھے۔ اور تل رکھنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ بس کے اردگرد ساٹھ ستر حاجیوں کا ہجوم جمع تھا۔ معلم کا بیٹا انہیں سمجھا رہا تھا کہ انہوں نے انتظام تو تین بسوں کا کیا تھا' لیکن کسی وجہ سے اب تک صرف ایک بس میسر آئی ہے۔ اب جو لوگ ٹیکسی کا کرایہ ادا کر سکتے ہیں' وہ ٹیکسی تلاش کر لیں۔ باقی حضرات پیدل منیٰ کو روانہ ہو جائیں۔ یہ سن کر نالے کے کنارے والے میرے ساتھی ہنسی خوشی پیدل چل پڑے۔ میں بھی ان کے ہمراہ ہو گیا۔

شہر سے نکل کر جب کھلی سڑک پر آئے تو احرام پوش مخلوق کا ایک جم غفیر سیلاب کی لہروں کی طرح منیٰ کی طرف پاپیادہ رواں دواں تھا۔ ان کے درمیان بسوں اور ٹرکوں اور موٹرکاروں کی بے ترتیب قطاریں ایک دوسرے کے ساتھ لپٹی ہوئی آہستہ آہستہ رینگ رہی تھیں۔ بڑی سڑک پر پہنچتے ہی نالے کے کنارے والے ساتھی بھی ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ اب میں بالکل اکیلا اور آزاد تھا' اور اس آزادی کی لذت ایک تیز و تند نشے کی طرح میری رگوں میں سرسرانے لگی۔ فضا میں تلبیہ کی گونج کا سائبان تنا ہوا تھا اور زمین پر ہزاروں مضطرب قدم تیز رفتاری سے ایک ہی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ہر شخص اپنی دھن میں مست اور بے خود تھا۔ ہر شخص گمنام تھا۔ ہر شخص بے جنس تھا۔ ہر شخص لاتشخص تھا۔ چلتے چلتے ایک ضعیف العمر آدمی لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ کسی نے اس کی نبض ٹٹول کر اعلان کیا۔ "خلاص" کسی دوسرے نے اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ اور اس کی لاش کو گھسیٹ کر سڑک کے کنارے لگا دیا۔ باقی لوگ بدستور چلتے رہے۔ لبیک اللھم لبیک۔

منیٰ کے چپے چپے پر کلاہ باراں کی طرح خیموں کی چھتری بنی ہوئی تھی۔ گرد وپیش کی پہاڑیوں پر جا بجا چونے کی سفیدی بکھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ قریب جا کر دیکھا' تو یہ چونے کی قلعی نہ تھی بلکہ احرام پوش حاجیوں کے گروہ تھے جو پہاڑیوں کی ڈھلوانوں

For more books visit www.4Urdu.com

پر بسیرا ڈالے بیٹھے تھے۔ ان کی تقلید میں میں نے بھی ایک چٹان کے سائے میں پناہ ڈھونڈھ لی۔ اگلی صبح لاکھوں کا یہ قافلہ میدان عرفات کی جانب روانہ ہوا' ان کے پیچھے پیچھے میں بھی وہاں پہنچا۔ کچھ لوگوں نے جبل رحمت کے دامن میں بیٹھ کر وقوف کیا۔ میں نے بھی کہیں قریب ہی جگہ ڈھونڈھ لی۔ شام کو سب کے پیچھے پیچھے مزدلفہ پہنچا۔ مزدلفہ کی چاندنی رات ختم ہوتے ہی۔ اس عظیم الشان تنہائی کے لمحات بھی رخصت ہو گئے جو منیٰ اور عرفات اور مزدلفہ میں لاکھوں کے ہجوم نے مجھے عطا کئے تھے دشت و بیابان اور کنج عزلت کی تنہائی میں سکوت ہوتا ہے۔ ہجوم عرفات کی تنہائی میں سکون ہی سکون تھا۔

منیٰ واپس پہنچ کر قربانی کے مقام پر اچانک میری مڈبھیڑ اپنے معلم عبدالرزاق محبوب سے ہو گئی وہ بڑا خوش تھا کہ میں اس کے لیے کسی جگہ بھی درد سر نہیں بنا۔ انعام کے طور پر اس نے قربانی کے سلسلے میں میری خواطر خواہ مدد کی اور دوسرے روز جب ہم مکہ معظمہ کو واپس لوٹے' تو مجھے اپنی بس کی چھت پر بیٹھنے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔

مکہ معظمہ واپس آتے ہی میرے سر پر مدینہ منورہ پہنچنے کی دھن سوار ہو گئی' لیکن معلم عبدالرزاق محبوب نے بڑی سنگدلی سے مجھے سمجھایا کہ میرے مدینہ شریف روانہ ہونے کی تاریخ سعودی حکومت سے مقرر ہو کر آئے گی۔ اس وقت تک میں صبر سے کام لوں اور بار بار اپنا پاسپورٹ مانگ کر اسے دق نہ کروں۔ ساتھ ہی اس نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر میں نے مدینہ مدینہ کی رٹ لگا کر اسے زیادہ تنگ کیا' تو وہ رئیس المعلمین کے پاس میری شکایت کر دے گا اور رئیس المعلمین کو اختیار ہے کہ وہ میرا پاسپورٹ ضبط کر کے مجھے پولیس کے حوالے کر دے۔

معلم کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے خانہ کعبہ کی راہ لی۔ راستے میں چلتے چلتے میں دل ہی دل میں بڑی چالبازی اور چابکدستی اور بڑی فن کاری سے ایسے دعائیہ فقرے تراشتا خراشتا رہا' جن سے یہ مطلب نہ نکلے کہ میں خدانخواستہ مکہ معظمہ سے تنگ آ کر یہاں سے بھاگنا چاہتا ہوں' بلکہ جن سے فقط یہ ظاہر ہو کہ میں اللہ کے رسول

For more books visit www.4Urdu.com

مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت میں مدینہ منورہ جانے کے لیے بے تاب ہوں۔ میں اسی ادھیڑ بن میں چلا جا رہا تھا کہ سڑک پر سامنے سے پاکستان ایمبیسی کی ایک کار آتی ہوئی دکھائی دی۔ کار میں سفارت خانے کا کچھ عملہ سوار تھا۔ ان میں سے ایک صاحب مجھے پہچانتے تھے۔ انہوں نے کار روکی اور علیک سلیک کے بعد چھوٹتے ہی پوچھا:

آپ مدینہ منورہ چلیں گے؟"

"جی ہاں' ضرور۔" میں نے بوکھلا کر کہا۔ "لیکن کیسے؟"

انہوں نے بتایا کہ خشکی کے راستے آیا ہوا پاکستانی حاجیوں کا ایک قافلہ آج شام جدہ سے مدینہ منورہ روانہ ہو رہا ہے۔ اگر میں اس میں شامل ہونا چاہوں تو ابھی ان کے ساتھ کار میں بیٹھ کر جدہ روانہ ہو جاؤں۔

میں نے بھاگ دوڑ کر کے روا روی میں الوداعی طواف کیا۔ نالے کے کنارے سے اپنے سامان کی پوٹلی اٹھائی۔ ایمبیسی کے عملے نے میرے معلم سے میرا پاسپورٹ وصول کیا' اور پورے ساڑھے تین گھنٹے کے اندر اندر میں راولپنڈی کی حج ٹرانسپورٹ کمپنی کے قافلہ میں بیٹھا ہوا جدہ سے بسوئے مدینہ رواں تھا۔ آں خنک شہرے کہ آں جا دلبراست!

اس زمانے میں جدہ سے مدینہ منورہ جانے والی سڑک پکی نہ بنی تھی۔ بس ایک کشادہ سا روڑے دار راستہ تھا' جو کہیں سے کچا تھا' کہیں سے سنگلاخ تھا' کہیں اونچا تھا' کہیں نیچا تھا اور بسیں اور ٹرک اور موٹر گاڑیاں اس پر ہچکولے کھاتی کشاں کشاں چلتی رہتی تھیں۔ شدید گرمی کی وجہ سے دن کے بیشتر حصہ میں ٹریفک بند رہتا تھا اور ساری رات اس پر گاڑیوں کی گہما گہمی رہتی تھی۔ ہمارا قافلہ بھی رات بھر چلتا رہا اور صبح دس بجے کے قریب مدینہ منورہ سے چار پانچ میل اس طرف رک گیا۔ یہاں پر ایک کنواں تھا جس پر رہٹ چل رہا تھا۔ قافلے والوں نے یہاں اتر کر غسل کیا اور نئے کپڑے پہنے۔ کچھ عقیدت مند بسوں پر دوبارہ سوار ہونے کی بجائے یہاں سے احتراماً پیدل چلنے لگے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے پیدل روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دور چل کر خیال آیا کہ

For more books visit www.4Urdu.com

دیارِ حبیب میں جوتے پہن کر داخل ہونا بھی ایک طرح کی بے ادبی ہے۔ میں نے فوراً اپنے چپل کھول کر ہاتھ میں اٹھا لیے اور برہنہ پا چلنے لگا۔ دھوپ میں تپتے ہوئے سنگریزوں پر پاؤں پڑتے ہی میرے تلووں میں آگ کے شعلے سے لپکے اور حرارت کی لہریں بجلی کی کرنٹ کی طرح میرے جسم میں پھیل کر دماغ سے ٹکرانے لگیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر چپکے سے اپنے چپل دوبارہ پہن لیے۔ اپنے جذبہ احترام کے اس بودے پن پر مجھے اس قدر جھنجھلاہٹ اور ندامت محسوس ہوئی کہ میں نے اپنے چپل پھر کھولے اور انہیں اٹھا کر سڑک سے دور جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ اب ننگے پاؤں چلنا ایک امر مجبوری تھا' لیکن میری خود فریبی اس مجبوری کو احترام کا نام ہی دیتی رہی۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ چلنے کے بعد ایک موڑ آیا جس کی گولائی پر چند گاڑیاں رکی ہوئی تھیں اور بہت سے لوگ سڑک پر کھڑے والہانہ انداز میں درود و سلام پڑھ رہے تھے یہ اس بات کی علامت تھی کہ ان حضرات کو اپنا گوہر مقصود نظر آ گیا ہے۔ میری عمر اس وقت بتیس تینتیس برس تھی۔ اس طویل عرصہ میں میری آنکھوں نے زندگی کی کثافت اور رذالت اور رکاکت اور خباثت کے علاوہ اور کچھ بہت کم دیکھا تھا۔ اب جی چاہتا تھا کہ گنبد خضرا پر نگاہ ڈالنے سے پہلے ان گناہگار آنکھوں کو کسی قدر صاف کر لوں۔ اس مقصد کے لیے شاہراہ مدینہ کی خاک سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی تھی؟ میں نے اضطراراً چلتی ہوئی سڑک سے خاک کی ایک چٹکی اٹھائی اور اسے اپنی آنکھوں کا سرمہ بنا لیا۔

مسجد نبوی تک پہنچتے پہنچتے میری آنکھیں سرخ ہو کر سوج گئیں' اور راستہ نظر آنا مشکل ہو گیا۔ قدم قدم پر راہگیروں سے ٹکر لگتی تھی۔ مجھے اندھا سمجھ کر ایک بھلے آدمی نے میری رہنمائی کی اور مجھے باب جبریل تک پہنچا دیا۔

باب جبریل پر عاشقان رسول کا ہجوم تھا۔ اندر جانے والوں اور باہر آنے کا غیر منقطع تانتا بندھا ہوا تھا۔ ایک نورانی بزرگ چٹائی پر بیٹھے لوگوں کے جوتے سنبھالنے میں مصروف تھے۔

For more books visit www.4Urdu.com

میری آنکھوں میں اب تک دھند سی چھائی ہوئی تھی اور بھیڑ کے ریلے میں پھنس کر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ میں آگے بڑھ رہا ہوں یا پیچھے جا رہا ہوں۔ ایک مقام پر میں چند لوگوں سے ٹکرا کر بری طرح لڑکھڑایا اور جوتوں کے ڈھیر پر اوندھے منہ گر پڑا۔ جوتوں کی رکھوالی کرنے والے صاحب نے سہارا دے کر مجھے اٹھایا اور اپنے پاس چٹائی پر بٹھا لیا' وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتے تھے۔ میری آنکھیں سوجی ہوئی اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ اپنی صراحی سے پانی کا گلاس پلا کر انہوں نے ازراہ ہمدردی دریافت کیا کہ میری آنکھوں کو کیا مرض لاحق ہے۔ میں نے شاہراہ مدینہ کی خاک کی چٹکی والا واقعہ بے کم و کاست بیان کر دیا۔ اسے سن کر وہ بے اختیار رو پڑے اور مجھے وہیں بیٹھے رہنے کی ہدایت کی۔ عصر کی نماز سے پہلے وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے اور جالی مبارک کے سامنے کھڑے ہو کر بڑے سوز و گداز سے درود و سلام پڑھایا۔ نماز کے بعد وہ مجھے پھر اپنے پاس باہر چٹائی پر لے آئے۔

یہ صاحب مشرق اور مغرب میں بہت سے ملکوں کی سیاحی کر چکے تھے۔ عربی تو ان کی مادری زبان تھی۔ اس کے علاوہ ترکی' فارسی اور انگریزی خوب جانتے تھے۔ کسی قدر فرانسیسی زبان سے بھی آشنا تھے۔ اٹھارہ انیس برس سے روضہ رسول اور مسجد نبوی کی صفائی کے انتظامات کے ساتھ وابستہ تھے۔ حج کے زمانے میں جب زائرین کا رش بڑھ جاتا تھا' تو یہ صاحب رضا کارانہ طور پر باب جبریل کے باہر جوتے سنبھالنے کے کام میں بھی ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ انہوں نے میرا پاسپورٹ دیکھا اور ہنس کر بولے۔ "تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔ میری اردو بڑی کمزور ہے۔ آؤ انگریزی میں گفتگو کریں۔"

جب انہیں معلوم ہوا کہ میرے رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے' تو مغرب کے بعد وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ جو مسجد نبوی کے بالکل قریب واقع تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کھانا کھلایا' اپنے کپڑوں کا ایک صاف جوڑا عنایت کیا۔ بازار سے نئے چپل لا کر دیئے اور ایک ڈاکٹر کی دکان پر جا کر میری آنکھوں میں دوا ڈلوائی۔ ساتھ ہی انہوں نے فرمایا کہ میں رات بھی ان کے ہاں گزاروں۔ میں نے التماس کی کہ اگر وہ مجھے باب جبریل

For more books visit www.4Urdu.com

کے باہر اپنی چٹائی پر شب بسری کی اجازت دے دیں تو مجھ پر بڑا احسان ہو گا اس پر وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے اور پھر بولے۔ "اس کی اجازت تو نہیں' خیر' عشا کے بعد دیکھا جائے گا۔"

URDU4U.COM

عشاء کے بعد جب مسجد نبوی کے دروازے بند ہو گئے تو وہ اندر ہی رہے' ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد اپنے سرکاری فرائض سے فارغ ہو کر باہر آئے اور مجھے ایک کاغذ دیا جس پر عربی میں کچھ لکھا ہوا تھا اور نیچے مہر لگی ہوئی تھی۔ فرمایا۔ "تم اس چٹائی پر رات گزار سکتے ہو۔ اگر کوئی اعتراض کرے تو یہ اجازت نامہ دکھا دینا۔"

تہجد کی اذان ہونے تک کئی سپاہیوں نے کئی بار آ کر مجھے ٹوکا' لیکن اجازت نامہ دیکھ کر وہ خاموش ہو جاتے تھے۔

ایک روز تو جوتے رکھنے والے صاحب نے اپنی کرم فرمائی کی انتہا کر دی۔ عشاء کے بعد جب مسجد نبوی کے دروازے بند ہونے لگے تو انہوں نے مجھے باہر نکالا اور تہجد کی اذان تک اپنے ساتھ اندر ہی رہنے دیا اور تھوڑی دیر کے لیے جالی مبارک کے اندر اس عرش بریں جیسی مقدس زمین پر مجھے اپنی پلکوں سے جاروب کشی کی اجازت بھی عطا فرمائی۔

اگلے روز انہوں نے مجھے مدینہ منورہ سے رخصت کر دیا۔ میں نے بہت عذر کیا کہ میرا یہاں سے ہلنے کو جی نہیں چاہتا' لیکن وہ نہ مانے۔ فرمانے لگے۔ پانی کا برتن بہت دیر تک آگ پر پڑا رہے' تو پانی ابل ابل کر ختم ہو جاتا ہے اور برتن خالی رہ جاتا ہے۔ دنیا داروں کا ذوق و شوق وقتی ابال ہوتا ہے۔ کچھ لوگ یہاں رہ کر بعد میں پریشاں ہوتے ہیں۔ ان کا جسم تو مدینہ میں ہوتا ہے' لیکن دل اپنے وطن کی طرف لگا رہتا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ انسان رہے تو اپنے وطن میں لیکن دل مدینہ میں لگا رہے۔"

وہ مجھے بسوں کے اڈے تک چھوڑ آئے اور جدہ جانے والی ایک بس میں مجھے ڈرائیور کے ساتھ والی اگلی سیٹ دلوا دی۔ نصف راستہ طے کرنے کے بعد ہم نے ایک جگہ دیکھا کہ ایک سیاہ فام افریقی نوجوان ننگے سر دھوپ میں پیدل چلا آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ

For more books visit www.4Urdu.com

اس کی بیوی تھی۔ بیوی کی گود میں ایک ننھا سا بچہ تھا۔ اس شدید دھوپ میں بھی یہ جوڑا بڑے اطمینان سے پاپیادہ مدینہ شریف کی طرف جا رہا تھا۔ ڈرائیور رحمدل آدمی تھا۔ بس روک کر اس نے ان مسافروں کو اپنی صراحی سے پانی پلایا۔ پانی دیتے ہوئے ڈرائیور نے انہیں بتایا کہ یہ پانی مدینہ سے آیا ہے۔ یہ سنتے ہی ان کے چہرے خوشی سے جگمگا اٹھے۔ انہوں نے ایک گھونٹ اپنے بچے کے منہ میں بھی ٹپکایا۔ پانی کے کچھ قطرے زمین پر گر گئے تھے۔ میاں بیوی نے جھک کر بھیگی ہوئی ریت اٹھائی' اور منہ میں ڈال لی۔

جدہ پہنچ کر بس اپنے اڈے پر رکی' تو سامنے طرح طرح کے ٹھنڈے مشروبات کی دکان نظر آئی۔ جدہ کی بندرگاہ پر اترنے کے بعد اب تک مجھے کوئی ٹھنڈی چیز پینے کا موقع نصیب نہ ہوا تھا۔ اب اس دکان کو دیکھ کر کوئی ٹھنڈی بوتل پینے کے لیے میرا دل بے اختیار مچلنے لگا۔ میں پیاسے اونٹ کی طرح اس دکان کی جانب لپکتا ہوا گیا۔ دکان میں عین سامنے ایک قد آدم آئینہ بھی لگا ہوا تھا۔ جب میں دکان کے قریب پہنچا' تو اس آئینے میں نظر آیا کہ میرے عین پیچھے سائے کی طرح لگا ہوا ایک نحیف و نزار' شکستہ صورت بڈھا بھی ہانپتا کانپتا اسی دکان کی طرف چلا آ رہا ہے۔ اس حالت زار پر رحم کھا کر میں ایک طرف ہو گیا' تاکہ مجھ سے پہلے اپنی خریداری کر لے' لیکن میں نے آئینے میں دیکھا کہ میری طرح وہ بھی اچک کر ایک طرف ہو گیا ہے۔ یہ نظارہ دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی' کیونکہ آئینے میں دراصل وہ میرا اپنا ہی عکس تھا۔ "آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے!" میں نے زور زور سے ہنس ہنس کر عرب دکاندار کو مخاطب کر کے یہ مصرعہ اتنی بار گنگنایا کہ وہ تنگ آ گیا۔ پاگل سمجھ کر اس نے یہ احتیاط بھی برتی کہ کوکا کولا کی قیمت پہلے وصول کی اور بوتل مجھے بعد میں دی۔ بوتل ابھی پوری طرح ختم نہ ہوئی تھی کہ دکاندار نے جھپٹ کر اسے میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ غالباً اسے یہ گمان گزرا ہو گا کہ یہ مخطوط الحواس شخص کہیں خالی بوتل کو پتھر پر مار کر توڑ نہ ڈالے۔ اپنی اس ہیئت کذائی پر کچھ حیران' کچھ پریشان اور کسی

For more books visit www.4Urdu.com

قدر خوشی میں یہ شعر گنگناتا ہوا حاجی کیمپ کی جانب روانہ ہو گیا

مرا اک کھیل خلقت نے بنایا
تماشہ دیکھنے بھی تو نہ آیا

URDU4U.COM

حاجی کیمپ میں معلم عبدالرزاق محبوب کا دفتر حاجیوں سے بدستور بھرا ہوا تھا۔ مکہ معظمہ میں نالے کے کنارے والے میرے چند سلہٹی ساتھی بھی وہاں بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "بابو' ہم نے خواب دیکھا کہ عبدالمصور نے دس ریال رشوت لے کر تمہارا ریٹرن ٹکٹ بنا دیا ہے۔"

ریٹرن ٹکٹ کا لفظ سنتے ہی میرا دل بلیوں اچھلنے لگا' اور میں نے بے صبری سے پوچھا "عبدلمصور کون ہے؟"

"بڑا چھپا ہوا بدمعاش ہے۔" سلہٹی ساتھی نے کہا۔ "نواکھیلی میں دس نمبر غنڈہ تھا۔ اب بھاگ کر کئی برس سے یہاں آ بیٹھا ہے۔ حاجیوں کو گھیر گھار کر پیسے بٹورتا ہے۔"

"اس وقت وہ کہاں ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"یہیں کہیں حاجی کیمپ میں بیٹھا کسی کو ٹھگ رہا ہو گا۔ اول درجے کا لفنگا ہے۔"

"خدا کے لیے مجھے اس سے ملاؤ۔" میں نے منت کی۔

میرے سلہٹی ساتھی نے بہت منع کیا کہ میں اس لپاٹئے کے چکر میں نہ پڑوں۔ لیکن میری مسلسل منت سماجت پر وہ میرے ساتھ چل کر اسے تلاش کرنے پر راضی ہو گیا۔ بڑی تگ و دو کے بعد وہ ایک چائے کی دکان پر بیٹھا مل گیا۔

میں نے اپنا سمندر جہاز کا ٹکٹ نکال کر اسے دکھایا اور کہا۔ "بھائی عبدالمصور' یہ جدہ سے کراچی کا ٹکٹ ہے۔ میری درخواست ہے تم اسے ریٹرن بنوا دو۔"

عبدالمصور نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ "اللہ کی نگری میں واپس آنے کا ٹکٹ یہاں نہیں بنتا۔ اوپر بنتا ہے۔" اس نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

For more books visit www.4Urdu.com

میں نے دس ریال اس کے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔ "بھائی اوپر ہی سے بنوا دو۔"
عبدالمصور نے دس ریال جیب میں ڈالے ہاتھ اٹھا کر بنگالی زبان مں کچھ من من کی'
اور بولا۔ "چلو ریٹرن ٹکٹ تو ہو گیا۔ اب چائے پلاؤ۔"
URDU4U.COM
دکان پر بیٹھے ہوئے کچھ لوگ یہ تماشہ دیکھ کر خوب ہنسے' انہوں نے عبدالمصور پر بہت سے پھبتیاں کسیں اور میرا بھی خوب مذاق اڑایا۔ میرے سلہٹی دوستوں نے میری چھیڑ ہی "ریٹرن ٹکٹ" ڈال دی۔ اب وہ مجھے میرے نام سے نہیں پکارتے تھے' بلکہ مذاق سے "ریٹرن ٹکٹ" کے لقب سے مخاطب کرتے تھے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ بات آخر عبدالمصور کی ہی پوری ہوئی' کیونکہ اس کے بعد مجھے ایک بار اور حج اور پانچ بار عمرہ ادا کرنیکی سعادت نصیب ہوئی۔

دو تین روز بعد کراچی جانے والا جہاز جدہ کی بندرگاہ پر آ گیا۔ ہماری ایمبیسی کا عملہ حاجیوں کو الوداع کہنے آیا ہوا تھا۔ انہوں نے جہاز میں مجھے ایک سنگل کیبن دلوایا جو ائیر کنڈیشنڈ تھا۔ اس میں فوم کے گدے کا برتھ تھا جس پر صاف ستھرا بستر لگا ہوا تھا' کیبن کا اپنا باتھ روم تھا۔ واش بیسن پر خوشبودار صابن کی نئی ٹکیا پڑی تھی۔ دائیں بائیں مختلف سائز کے رنگ دار تولیے لٹک رہے تھے..... کیبن میں داخل ہوتے ہی میری انا کا بے لگام گھوڑا جسے میں اپنی دانست میں مکہ معظمہ میں نالے کے کنارے چھوڑ آیا تھا۔ دولتیاں جھاڑتا سرپٹ بھاگتا ہوا آیا' اور ہنہنا کر ازسر نو اپنے تھا پر کھڑا ہو گیا۔

ساتھ ہی میرے ذہن میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی وہ غزل بھی دھند گئی جو حج کے دوران میری رگوں میں خون کی طرح رچ بس گئی تھی۔ یہ غزل ایک عجیب اور نادر فن پارہ ہے۔ ارکان حج' طواف کعبہ اور صاحب کعبہ کے حوالے سے ایک عاشق صادق کے جذب و مستی کا یہ ایک بے مثال اظہار ہے:

For more books visit www.4Urdu.com

رقم چو بمکہ ہوس کوئے تو کر دم
دیدم رخ کعبہ ہوس روئے تر کردم

URDU4U.COM

محراب حرم گرچہ بہ پیش نظرم شد
من سجدہ دلے درخم ابروئے تو کردم

درسعی طواف و بحطیم بمقامے
ہر سمت تمنا رخ نیکوئے تو کردم

لبیک دعا خواں ہمہ مخلوق بعرفات
چوں قبلہ نما من دل خود سوئے کر دم

در عرصہ عرفات بپا حشر نمو دم
چوں یاد من آں قامت و بجوئے تو کردم

قربانی حیواں بمعنی میکندعا
قربان سر خود من بسر کوئے تو کردم

"جب میں مکہ گیا تو میرے دل میں تمہارے کوچے کی آرزو تھی
کعبہ کا رخ دیکھا تو دل میں تمہارا رخ دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی
اگرچہ حرم کعبہ کی محراب میری نظر کے سامنے تھی
لیکن میں نے سجدہ صرف تمہارے خم ابروہی میں کیا
سعی میں طواف میں حطیم میں اور مقام ابرہیم پر
ہر جگہ ہر طرف میں نے تمہارے کوچے کے رخ کی تمنا کی

For more books visit www.4Urdu.com

میدان عرفات میں ساری مخلوق لبیک کہہ کر دعائیں مانگ رہی تھی
لیکن میرا دل قبلہ نما کی طرح صرف تمہاری طرف متوجہ تھا
اپنے دل میں تمہارے دل پسند قد کا تصور کر کے میں نے
URDU4U.COM
میدان عرفات میں قیامت برپا کر دی
مقام منا پر ایک دنیا جانوروں کی قربانی دیتی ہے
میں نے تمہارے کوچے کے سرے پر اپنا ہی سر قربان کر دیا"

وطن واپس پہنچ کر مجھے یہی محسوس ہوتا رہا کہ میں حج کی منزل طے کر کے نہیں بلکہ محض سراب منزل کے پیچھے بھاگ کر واپس آیا ہوں' خدا جانے تشنگی کا یہ احساس کبھی کم بھی ہو گا یا نہیں۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم!

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

- جھوٹ' فریب' فراڈ اور حرص کی دلدل

سر تو میں نے منیٰ میں منڈوایا تھا لیکن اولے کراچی آ کر پڑے۔ اسٹیبلشمنٹ ڈویژن والوں نے بتایا کہ میری پوسٹنگ صوبہ پنجاب کے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کے طور پر کر دی گئی ہے۔ اس لیے میں فوراً لاہور حاضر ہو جاؤں۔

URDU4U.COM

یہ عجب بے تکی پوسٹنگ تھی۔ صنعت و حرفت کا نہ مجھے کچھ علم تھا اور نہ اس کا کاروبار سے کوئی دلچسپی تھی۔ لاہور پہنچ کر یہی بات میں نے وزیر اعلیٰ ملک فیروز خاں نون سے کہی اور اس کام کے لیے اپنی ناموزونیت کا کھل کر رونا رویا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے' اور کہنے لگے۔ اس پوسٹ پر آنے کے لیے بہت سے لوگ ایڑھی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ لیکن ہمیں ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو پیسے نہ بنائے۔"

معلوم نہیں کہ چیف منسٹر کی اس بات سے میری ستائش منظور تھی یا میری آزمائش۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں پنجاب کے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کی پوسٹ سونے کی کان سمجھی جاتی تھی۔ میرے پیشرو مسٹر بی۔ اے قریشی بڑے قابل اور دیانت دار افسر تھے۔ انہوں نے سالہا سال کی محنت سے اس محکمہ کو نہایت اعلیٰ خطوط پر منظم کیا تھا اور اب وہ اتنے سینئر ہو گئے تھے کہ ترقی پا کر یہاں سے تبدیل ہو رہے تھے۔ صنعت و حرفت کے علاوہ انہیں ادب' فنون لطیفہ اور علم آثار قدیمہ سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ چارج چھوڑنے سے پہلے انہوں نے دو ڈھائی ماہ مجھے اپنے سائی عاطفت میں رکھ کر محکمے کے پیچ و خم سے آگاہ کیا اور عملی ٹریننگ کا یہ وقفہ میرے لیے بڑا مفید ثابت ہوا۔

شیخ مسعود صادق وزیر صنعت تھے۔ یہ امرتسر کے ایک امیر کبیر اور مشہور مسلم لیگی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور بڑے شریف النفس' سیر چشم اور خوش باش انسان تھے۔ البتہ

For more books visit www.4Urdu.com

سیاست ان کی گھٹی میں پڑی تھی' اس لے دفتری باضابطگیوں کو سیاسی مصلحتوں پر بے دریغ قربان کرنا ان کا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ذاتی لحاظ سے البتہ وہ بڑے صاف گو اور دیانتدار تھے۔

URDU4U.COM

اس زمانے میں سیاسی مصلحت دراصل سیاسی رشوت کا دوسرا نام تھا۔ ایک روز میں نے اخبار میں خبر پڑھی کہ پنجاب کی کابینہ نے صوبہ میں بناسپتی گھی کی چند نئی فیکٹریاں قائم کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ مجھے اس منصوبے کا کوئی علم نہ تھا اور نہ ہی محکمہ صنعت کے ذریعہ اس قسم کی کوئی تجویز کابینہ میں پیش کی گئی تھی۔ اس خبر کا شائع ہونا تھا کہ ہمارے دفتر میں فیکٹری لگانے کے خواہشمندوں کی درخواستیں دھڑا دھڑ آنا شروع ہو گئیں۔ درخواستوں کے ساتھ ساتھ پیروی کرنے والے سفارشی حضرات کا بھی تانتا بندھ گیا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں ان لوگوں کو کیا جواب دوں' کیونکہ مجھے اب تک اس فیصلہ کے متعلق سرکاری طور پر کوئی اطلاع موصول نہ ہوئی تھی اور دوسرے لوگوں کی طرح میری معلومات بھی فقط اخباری خبر تک محدود تھیں۔ جب لوگوں کا دباؤ بڑھ گیا تو میں نے یہ صورت حال وزیر صنعت کے گوش گذار کی اور ان سے رہنمائی کا طلب گار ہوا۔ انہوں نے فرمایا۔ "درخواستیں داخل دفتر کرتے جاؤ اور جو لوگ ملنے آئیں انہیں خوش اسلوبی سے ٹالتے جاؤ۔"

اس بات سے میں نے اندازہ لگایا کہ اخباروں میں شاید غلط خبر شائع ہو گئی ہے۔ اس لیے میں نے تجویز پیش کی کہ اگر اس خبر کی تردید کر دی جائے تو ہماری جان بہت سے بکھیڑوں سے بچ جائے گی۔

"خبر صحیح ہے۔" شیخ مسعود صادق نے فرمایا۔ "نئی فیکٹریاں منظور ہوئی ہیں اور انہیں مستحق پارٹیوں میں تقسیم بھی کر دیا گیا ہے۔"

یہ سن کر مجھے بڑی سبکی محسوس ہوئی اور سرکاری لحاظ سے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کی پوسٹ نہایت بے ضرورت' فالتو اور غیر موثر نظر آنے لگی۔ میں نے وزیر صاحب سے گلہ

For more books visit www.4Urdu.com

کیا کہ اگر وہ اپنے ڈائریکٹر کو اس فیصلے سے قبل اعتماد میں نہیں لے سکتے تھے تو کم از کم بعد میں ہی کچھ بتا دیا ہوتا۔

URDU4U.COM

وزیر صاحب نے جواب دیا۔ "یہ فیصلہ ایک ہنگامی ضرورت کے تحت کیا گیا ہے۔ سیاست میں ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ان معاملوں میں زیادہ حساس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

بڑی بڑی صنعتوں کے فیصلے اسی طرح ڈائریکٹر کے علم اور مشورے کے بغیر اوپر ہی اوپر طے ہو جاتے تھے۔ ان فیصلوں میں کسی مربوط ترقیاتی پلاننگ کا عمل دخل بہت کم ہوتا تھا۔ ان کا دارومدار زیادہ تر انواع و اقسام کی مصلحتوں' خوشنودیوں اور عنایت فرمائیوں پر ہوا کرتا تھا۔

جہاں تک چھوٹی صنعتوں کا تعلق ہے اس زمانے میں پنجاب میں بجلی سے چلنے والی کھڈیوں (Power Looms) اور آرٹ سلک کی گرم بازاری تھی۔ جسے دیکھو اس کے سر میں پاور لوم کا پرمٹ اور آرٹ سلک یارن کا امپورٹ لائسنس حاصل کرنے کا سودا سمایا ہوا تھا۔ ارباب صنعت و تجارت کے علاوہ اسمبلیوں کے ممبر' سیاسی پارٹیوں کے بااثر کارکن' وزیروں کے حاشیہ نشین' کچھ بڑے افسروں کی بیگمات اور جلدی دولت کمانے کے دوسرے رسیا صرف اسی لیلائے آرزو کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے تھے۔ اس دھما چوکڑی میں اگر کوئی سب سے پیچھے تھا' تو وہ بچارا پشینی نور باف تھا' جس کے آباواجداد صدیوں سے کھڈیوں کی دستکاری کے ساتھ وابستہ چلے آ رہے تھے۔ انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ سب سے پہلے ان لوگوں کی ضروریات کو پورا کیا جاتا اور اس کے بعد نئے آنے والوں کی باری آتی۔ رجسٹر آف کواپریٹو سوسائٹیز کے ساتھ مل کر ہمارے محکمے نے اس سلسلے میں تھوڑی بہت کوشش بھی کی لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کسی نے نہ سنی۔

پاور لوم کے پرمٹ مانگنے والوں کا زیادہ زور پانچ پانچ پاور لوم حاصل کرنے پر تھا۔ اس کے ساتھ انہیں کافی مقدار میں آرٹ سلک یارن کا امپورٹ لائسنس مل جاتا تھا' جسے بلیک مارکیٹ کر کے خاطر خواہ منافع کمایا جا سکتا تھا۔ کچھ لوگ تو پاور لومز کا پرمٹ

For more books visit www.4Urdu.com

بھی دست بدست بلیک مارکیٹ میں بیچ ڈالتے تھے۔ معدودے چند لوگ جو اپنے پاور لوم خود چلانا چاہتے تھے' وہ بھی اپنی مشینوں کی تعداد پانچ سے زیادہ نہ بڑھاتے تھے' کیونکہ اس طرح وہ فیکٹری ایکٹ کی پابندیوں سے آزاد رہتے تھے۔ دو دو پاور لوم مانگنے والوں کی تعداد بھی بے شمار تھی۔ ان کا مقصد بھی پرمٹ حاصل کر کے اسے بلیک مارکیٹ میں بیچنا ہی ہوتا تھا ایسے بہت کم لوگ تھے جو ان مشینوں کو خود چلانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

وزیر صاحبان جب دوروں سے واپس آتے تھے تو ان کے جلو میں پرمٹ لینے والوں کا ایک جم غفیر لاہور پہنچ جاتا تھا اور وزیروں کی سفارشات سے مزین درخواستیں لے کر میرے دفتر کا گھیراؤ کر لیتا تھا۔ اس سارے عرصہ میں فقط ایک پرمٹ ایسا تھا جو میں نے اس قسم کی سفارش یا دباؤ کے بغیر جاری کیا تھا۔ ایک روز ہمارے ممتاز ادیب اور دانشور مسٹر اے حمید مجھے ملنے آئے۔ وہ ان دنوں بے کار تھے اور پاور لوم کی کرشمہ سازی کا چرچا سن کر انہیں بھی اس لائن میں قسمت آزمائی کا خیال آیا۔ میں نے بڑی خوشی سے انہیں چند پاور لوموں کا پرمٹ دے دیا۔ دو ڈھائی ماہ بعد وہ پھر میرے دفتر میں آئے' اور بولے۔ "اس کاروبار کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ کام میرے بس کا روگ نہیں ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے پرمٹ مجھے واپس کر دیا۔ اس کی دلنشین تحریروں کی طرح اس صاحب طرز ادیب کا کردار بھی اتنا صاف اور بے داغ تھا کہ اس نے اپنے پرمٹ کو بلیک مارکیٹ میں بیچنا بھی گوارا نہ کیا۔

پاور لوم اور آرٹ سلک یارن کے علاوہ میرا براہ راست واسطہ گندگی کے ایک اور ڈھیر سے بھی تھا۔ اس کا تعلق تارکین وطن کی صنعتی املاک سے تھا۔

آزادی کے وقت جو ہندو اور سکھ بھارت چلے گئے تھے' وہ صوبہ پنجاب میں بہت سی فیکٹریاں' سینما گھر اور دیگر صنعتی ادارے چھوڑ گئے تھے۔ حکومت پاکستان کا فیصلہ تھا کہ ان فیکٹریوں اور صنعتوں کو کسی صورت میں بھی بند نہ ہونے دیا جائے اور انہیں ان مسلمان مہاجرین کو الاٹ کر دیا جائے جو اسی قسم کا کاروبار یا جائداد بھارت میں چھوڑ آئے ہیں۔ اس

For more books visit www.4Urdu.com

مقصد کے لیے ایک بورڈ قائم کیا گیا تھا اور ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کی حیثیت سے میں بھی اس بورڈ کا ممبر تھا۔

URDU4U.COM

بورڈ قائم ہوتے ہی درخواستوں کا ایسا سیلاب امڈ آیا کہ الامان و الحفیظ۔ جو کلیم داخل ہوئے ان سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ امرتسر سے لے کر دہلی' لکھنؤ اور پٹنہ تک جتنے صنعتی ادارے اور سینما گھر تھے' وہ زیادہ تر مسلمانوں ہی کی ملکیت تھے۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ مطالبے ضرور جائز حقوق پر مبنی ہونگے لیکن بہت سے کلیم صریحاً جھوٹ فریب اور جعلسازی کی پیداوار تھے۔ جتنا بڑا آدمی ہوتا تھا' اتنا ہی بڑا کلیم ہوتا تھا اور اس کی تہہ میں اتنا ہی بڑا جھوٹ اور فریب کارفرما تھا۔ کچھ لوگ بہ نفس نفیس بھارت جاتے تھے اور وہاں پر متروکہ املاک کے کسٹوڈین کے دفتر سے اپنی مرضی کے مطابق کاغذات اور سرٹیفکیٹ بنوا لاتے تھے۔ بھارتی کسٹوڈین کے دفتر میں جعلسازی کی فیکٹری کھلی ہوئی تھی۔ رشوت کے ریٹ مقرر تھے اور منہ مانگی رشوت دے کر ہر قسم کی ملکیت کی تصدیق کرائی جا سکتی تھی۔ اس صنعتی املاک کی تقسیم نے حرص و ہوا کے جو دروازے کھولے' اس نے ہمارے معاشرے میں اخلاقی گلن' سڑن' بداطواری' بددیانتی۔ جھوٹ' فریب اور جعلسازی کو بڑا فروغ دیا۔

ایک روز میں دفتر سے گھر واپس آیا' تو برآمدے میں ایک صاحب بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے عربی لباس پہنا ہوا تھا اور عطر کی خوشبو میں بسے ہوئے تھے۔ ان کی بڑی شاندار سیاہ داڑھی تھی' آنکھوں میں سرمہ تھا اور ہاتھ میں سفید منکوں کی تسبیح کھٹا کھٹ چل رہی تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ابھی حال ہی میں عمرہ کر کے آئے ہیں اور کل رات داتا صاحب کے مزار پر مراقبہ کر رہے تھے۔ داتا صاحب نے انہیں حکم دیا ہے کہ وہ میری خدمت میں حاضر ہو کر مجھے تحفہ دیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے مجھے ایک جانماز' ایک تسبیح' آب زمزم کی ایک سر بمہر کپی اور چند کھجوروں کا تحفہ دیا اور ساتھ ہی فرمایا' "حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ میں آپ

For more books visit www.4Urdu.com

کو اپنے ساتھ لے کر ان کے مزار پر حاضری دوں۔ آپ وضو کر کے تیار ہو جائیں۔ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔"

یہ نادر شاہی حکم مجھے عجیب سا لگا۔ بھلا داتا صاحب کو کیا پڑی ہے کہ وہ ایک اجنبی کو اس طرح میرے پیچھے بھگاتے پھریں۔ ان کی بات کا مجھے یقین تو نہ آیا' لیکن ان کی نورانی وضع قطع کے سامنے صاف طور پر انکار کرنے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔ میں نے کسی اور وقت حاضری دینے کا بہانہ بنایا تو وہ جلال میں آ گئے اور بزرگوں کے احکام کی نافرمانی کے سنگین نتائج سے مجھے خوب ڈرایا۔ ان کی چرب زبانی سے مرعوب ہو کر میں نے طوعاً و کرہاً انہیں اپنی کار میں بٹھایا اور داتا صاحب پہنچ گیا۔

داتا صاحب پہنچتے ہی دس بارہ آدمیوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک صاحب نے سبز رنگ کی باریک ململ کا دوپٹہ میرے سر پر پگڑی کے طور پر باندھ دیا۔ کچھ لوگوں نے میرے گلے میں گیندے کے پھولوں کے ہار ڈالے اور پھر وہ سب مجھے دھکیل دھکال کر ایک حجرے میں لے گئے۔ حجرے میں بیٹھتے ہی نعت خوانی شروع ہو گئی اور پھر پلاؤ' زردہ' قورمہ' کباب' مرغ مسلم اور طرح طرح کی نعمتوں سے بھری ہوئی قابوں کا تانتا لگ گیا۔ میں نے کسی چیز کو ہاتھ لگانے سے صاف انکار کر دیا۔ سب نے شور مچایا کہ یہ داتا صاحب کا تبرک ہے۔ اسے کھا کر برکت حاصل ہوتی ہے لیکن میں معافی مانگ کر اٹھنے لگا' تو اچانک عربی لباس والے بزرگ نے کاغذوں کا ایک پلندا میرے حوالے کر کے کہا۔ آپ اسے گھر جا کر پڑھیں۔ اس میں جو لکھا گیا ہے وہ حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کی ہدایات کے عین مطابق ہے۔ اس پر عمل کرنے سے آپ کو فلاح نصیب ہو گی۔"

یہ کاغذات ایک متروکہ سینما ہاؤس کی الاٹمنٹ کے متعلق تھے۔ میں نے دفتر سے متعلقہ فائل نکلوا کر دیکھی تو یہ عقدہ کھلا کہ عربی لباس والے بزرگ ایک شہر کے لوکل باشندے اور پیر تھے۔ وہاں پر ایک مقامی سینما انہوں نے جعلسازی سے اپنے نام الاٹ کرا رکھا

For more books visit www.4Urdu.com

تھا۔ اب انہوں نے درخواست دے رکھی تھی کہ یہ الاٹمنٹ ان کے نام کنفرم کر دی جائے! میں نے داتا صاحب والے ڈھونگ کا قصہ بورڈ کے ایک اور ممبر کو سنایا' تو انہوں نے بتایا کہ یہی حضرت ان کے پاس کچھ "اور طرح کا سامان" لے کر تشریف لائے تھے اور غصہ میں آ کر انہوں نے ان پر اپنا کتا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اس بات کا افسوس رہا کہ بورڈ نے صرف ان کے سینما کی الاٹمنٹ منسوخ کی اور ان پر جعلسازی کا مقدمہ دائر نہ کیا۔

ایک صاحب نے اپنی درخواست میں لکھا تھا کہ وہ جو جائداد بھارت چھوڑ آئے ہیں ان میں دلی کا لال قلعہ بھی شامل ہے۔ انہیں اس کی قیمت اور تاریخی عظمت کے مطابق معاوضہ دیا جائے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کا شجرہ نسب آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ براہ راست ملتا ہے۔

ایک سرکس والے نے اپنے شیر کا معاوضہ مانگا تھا' جسے وہ بھارت چھوڑ آیا تھا۔ بورڈ کے ممبروں نے اسے بتایا کہ ہم تو صرف غیر منقولہ جائداد کا معاوضہ دیتے ہیں۔ شیر تو چلتا پھرتا متحرک درندہ ہے' اس کا معاوضہ دینا بورڈ کے اختیار میں نہیں۔ سرکس والے نے برجستہ جواب دیا' "صاحب' شیر تو پنجرے میں بند رہتا ہے۔ پنجرہ تو غیر منقولہ ہے۔"

ایک صاحب پانچ تانگے بھارت چھوڑ آئے تھے اور ان کے عوض کسی فیکٹری کے طلبگار تھے۔ ان سے بھی یہی کہا گیا کہ تانگے غیر منقولہ جائداد کے شمار میں نہیں آتے' اس لیے ہمارا بورڈ ان کا معاوضہ دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اس پر درخواست دہندہ نے کہا' "جناب' میرے تانگے غیر منقولہ تھے' کیونکہ میں ان میں گھوڑے نہیں جوتتا تھا۔"

ایک شخص محمد دین نے ضلع لدھیانہ کے کسی گاؤں میں آٹا پیسنے کی مشین لگائی ہوئی تھی۔ اس نے اس کی مالیت دو ہزار دو سو روپے درج کی ہوئی تھی۔ مشین خریدنے کی اصل رسید بھی درخواست کے ساتھ منسلک تھی۔ ہمارا بورڈ پانچ ہزار روپے سے زیادہ مالیت کے اثاثوں کا فیصلہ کرتا تھا۔ میں نے محمد دین سے کہا کہ اگر اس نے اپنی مشین کی قیمت دو ہزار دو سو کی جگہ پانچ ہزار روپے درج کی ہوتی تو بورڈ اسے ضرور معاوضہ دے

For more books visit www.4Urdu.com

دیتا۔ کیونکہ اس کے کاغذات بڑے صاف اور سچے ہیں۔
اس نے جواب دیا۔ "اچھا میری قسمت ہی دو ہزار دو سو ہے تو میں پانچ ہزار کیسے لکھ
URDU4U.COM
دیتا۔"
میں نے کہا۔ "تم نے یہ مشین آٹھ برس پہلے خریدی تھی۔ اب تو قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔
اب تو اس کی قیمت پانچ ہزار سے اوپر ہو گی۔"
محمد دین ہنسا۔ "صاحب' آپ بھی بڑے بھولے ہیں۔ پرانی ہو کر تو مشین کی قیمت گھٹتی
ہے' بڑھا نہیں کرتی۔"
محمد دین کو ہم کچھ نہ دے سکے' لیکن وہ ہمیں بہت کچھ دے گیا۔ صبح سے لے کر
شام تک ہمارے بورڈ کو جھوٹ' فریب اور لالچ کے جس طوفان بے تمیزی کا سامنا کرنا
پڑتا تھا' اس ماحول میں محمد دین جیسے انسان دیانت اور امانت اور پاکیزگی کے وہ ستون
تھے جن کی برکت سے قومیں زندہ رہتی ہیں اور پروان چڑھتی ہیں۔

اسی زمانے میں حکومت پنجاب نے بوریوالا میں ایک ٹیکسٹائل مل قائم کرنے کا ڈول بھی
ڈال رکھا تھا۔ باقی بہت سے سرکاری منصوبوں کی طرح اس فیکٹری کی تعمیر میں بھی
غیر معمولی تاخیر واقع ہو رہی تھی۔ مل کی تعمیر پر پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا جو عملہ مامور تھا اس
کا مستقل واویلا یہی رہتا تھا کہ رقم ختم ہو گئی ہے۔ مزید فنڈ فوراً فراہم کئے جائیں۔
ایک روز میں وزیر صنعت شیخ مسعود صادق کے ہمراہ بوریوالا گیا۔ صورت حال کا معائینہ
کرنے پر منکشف ہوا کہ تخمینہ سے کہیں زیادہ رقم خرچ ہو چکی ہے لیکن کام ابھی تک
جوں کا توں ادھورا پڑا ہے۔ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے چند سینئر افسروں کو جمع کر کے وزیر
صاحب نے ان کو خوب آڑے ہاتھوں لیا اور یہ دھمکی دی: "تم لوگوں کا ہاضمہ بڑا تیز
ہے۔ سارے کا سارا بجٹ ہضم کر بیٹھے ہو اور کام ابھی پورا نہیں ہوا۔ اب مزید کچھ
رقم نہیں آئے گی۔ دو ماہ کے اندر اندر کام ختم نہ ہوا تو ہماری بجائے پولیس ہتھکڑیاں
لے کر آئے گی۔"

For more books visit www.4Urdu.com

یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور خدا خدا کر کے فیکٹری کی تعمیر پایہ تکمیل تک پہنچی۔ دوراندیشی سے کام لے کر صوبائی حکومت نے فیصلہ کیا کہ اس ٹیکسٹائل مل کو چلانے کے لیے مناسب شرائط پر حبیب بنک کے حوالے کر دیا جائے۔ ورنہ فیکٹری کی کارگزاری بھی محکمانہ سرخ فیتے میں الجھ کر رہ جائے گی۔

اس سلسلے میں حبیب بنک کے جو نمائندے چند بار مجھے ملنے آئے' ان سے میں بہت متاثر ہوا۔ یہ جواں سال' خوش لباس اور خوش کلام نمائندے اپنے بینک کی نمائندگی نہایت رکھ رکھاؤ' خوش اخلاقی' خودداری اور صاف گوئی سے نبھاتے تھے۔ ان کا نام آغا حسن عابدی اور ابن حسن برنی تھا۔ متروکہ صنعتوں کی الاٹ منٹ حاصل کرنے اور جھوٹ' فریب' فراڈ اور حرص کے مارے ہوئے ہجوم سے نپٹ کر جب ان دو حضرات سے ملاقات ہوتی تھی تو اچانک یوں محسوس ہوتا تھا جیسے تازہ ہوا کا جھونکا آ جائے۔ بوریوالا مل کے علاوہ کبھی کبھی ادب آرٹ اور موسیقی پر بھی دلچسپ گفتگو ہو جاتی تھی۔ سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر میں نے ان دونوں کے ساتھ کوئی خاص یا غیر معمولی سلوک نہیں کیا۔ لیکن یہ ان کے حسن اخلاق کی دلیل ہے کہ اس زمانے سے لے کر آج تک انہوں نے میرے ساتھ انتہائی باخلوص' بے لوث' بے ریا اور بے غرض دوستی کا رشتہ نبھایا ہے۔

بنکاری کی دنیا میں آج آغا حسن عابدی کا نام سارے جہان میں نہایت آب و تاب سے گونج رہا ہے۔ حبیب بنک لاہور کی برانچ سے اٹھ کر انہوں نے بنکاری کی عالمگیر برادری میں جو مقام پیدا کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن یہ حیرت ناک کامیابی ان کی خوش اخلاقی' خوش کلامی اور انسان دوستی پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوتی۔ اپنے جیٹ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر دنیا بھر میں مشین کی طرح کام کرتے ہوئے بھی اگر کہیں ان کا کوئی پرانا دوست یا رفیق کار نظر آ جائے تو اس کے ساتھ خلوص اور تپاک سے ملنے میں ہمیشہ پہل کرتے ہیں۔ ان کی شدید مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ بسا اوقات وہ ایک ایک ملک میں چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں ٹھہر پاتے۔ لیکن کوئی دوست مل کر گھنٹوں بیٹھا رہے' تو نہ تو وہ کسی بے چینی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور نہ ہی بار بار اپنی گھڑی کی جانب

For more books visit www.4Urdu.com

نگاہ ڈالتے ہیں۔

حبیب بنک میں تقریباً ۱۲ سال گزارنے کے بعد انہوں نے یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ (یو۔ بی۔ ایل) کی بنیاد ڈالی' جس نے پاکستان میں بینکاری کو ایک نئی روش اور ایک نئے معیار سے روشناس کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نیشنل بینک کے بعد ہمارے وطن کا یہ دوسرا سب سے بڑا بینک مان لیا گیا' جس کی پاکستان میں ۹۱۲۔ اور بیرون ملک میں ۲۴ برانچیں کھل گئیں۔ اندرونی برانچوں میں ۲۲۴ شاخیں مشرقی پاکستان میں قائم تھیں۔ یو بی ایل نے بین الاقوامی سطح پر اپنا خاص رنگ جمایا اور خلیج کی امارات سمیت مشرق وسطیٰ میں تیل کی حکومت میں جب یو۔ بی۔ ایل قومیا لیا گیا تو آغا صاحب نے بھی اپنی مالیاتی مہارت کا رخ مغرب کی جانب موڑ دیا۔

مغربی دنیا میں آغا حسن عابدی کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی حقیقت ایک افسانے سے بھی زیادہ عجیب اور حیران کن ہے۔

انہوں نے بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس انٹرنیشنل کے نام سے ایک بین الاقوامی ادارہ قائم کیا' جس کے صدر نشین وہ خود ہیں۔ یہ بینک ایک واحد اور مکمل بالذات ادارہ نہیں' بلکہ اپنے ساتھ ملحق ایک وسیع اور متنوع مالیاتی فنون کے اداروں کے مجموعے کا مرکز ہے۔ تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن بھی اس مجموعے کا ایک حصہ ہے۔ بی۔ سی۔ سی۔ اینڈ آئی کی دنیا بھر کے ستر ممالک میں ساڑھے تین سو سے زیادہ شاخیں کام کر رہی ہیں۔ اس کا ہیڈ کوارٹر نمبر ۱۰۰ لیڈن ہال سٹریٹ لندن میں ہے۔ اسی گلی میں ذرا سے فاصلے پر وہ مقام ہے جہاں پر ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد ڈالی گئی تھی' جس نے رفتہ رفتہ برطانیہ کی ایسی شہنشاہی کی داغ بیل ڈالی جس کی قلمرو پر سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا۔

اکتوبر ۱۹۸۱ء میں لندن میں وہاں کے ایک مشہور رسالے "نیو سٹیٹسمین (New Statesman) کا ایک شمارہ میری نظر سے گزرا۔ اس کے سرورق پر آغا حسن عابدی کی بڑے سائز کی رنگین تصویر تھی' جس کے نیچے یہ درج تھا: "ہائی سٹریٹ کا بینکر جو حکومتیں خرید

For more books visit www.4Urdu.com

لیتا ہے۔" (The High- Street Banker who buys Governments) رسالے کے اندر بی۔ سی۔ سی۔ آئی کے حوالے سے آغا صاحب کے بارے میں چار صفحات کا طویل مضمون بھی درج تھا۔ مضمون کا فقرہ حسد' رقابت' خوف' اور نفرت کی بھٹی میں بجھا ہوا تھا' جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ صاحب مضمون کے مطابق بی۔ سی۔ سی۔ اینڈ آئی ایک ایسا بینک تھا' جو خطرناک تیز رفتاری سے دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل رہا تھا۔ اس مضمون کے مطابق جنوبی امریکہ' لاطینی امریکہ' افریقہ' ایشیا' مشرق وسطیٰ اور یورپ کے اہم کاروباری مراکز میں پاؤں جمانے کے علاوہ انگلستان میں بھی اس کی پچاس سے اوپر برانچیں قائم ہو چکی تھیں۔ ترقی اور وسعت کی یہ تیز رفتاری انگلستان کے اونگھتے ہوئے ست رو' سردمہر' بے حس اور سرخ فیتوں میں جکڑے ہوئے غیر مثالی بینکوں کے لیے ایک زبردست خطرے کا نشان بن گئی تھی۔ ایک طرح سے ایک پاکستانی اس بینک کو قائم کر کے برطانوی سامراج کی ڈیڑھ دو صدی کا قرضہ کم از کم اقتصادی شعبے میں بڑی کامیابی سے چکا رہا تھا۔

اس تنقیدی اور تنصیبی مضمون کے مطابق بی۔ سی۔ سی اینڈ آئی کی مثال ترقی اور تعمیر کا راز اس کے پریذیڈنٹ آغا حسن عابدی کی مالیاتی اور اقتصادی مہارت میں نہیں بلکہ ان کی سیاسی شعبدہ بازی میں مضمر تھا۔ اس سیاسی مہارت سے کام لے کر وہ بہت سے ملکوں کے سربراہوں اور حکومتوں کو اپنی مٹھی میں رکھتے تھے اور ان کی سرپرستی سے فائدہ اٹھا کر اپنے بینک کو ترقی دیتے تھے۔

یہ مضمون پڑھ کر مجھے یہ کرید لگ گئی کہ میں آغا صاحب سے مل کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں کہ ان کی ترقی کا اصلی راز کیا ہے' جس کی وجہ سے ان کے خلاف حسد اور بغض کے اتنے بڑے بدنام کن شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد لیڈن ہال سٹریٹ والے ہیڈ کوارٹر میں مجھے یہ موقع مل گیا۔ بینک کی ایک پانچ چھ گھنٹے کی طویل میٹنگ سے فارغ ہو کر جب وہ مجھے ملے تو ہشاش بشاش تھے۔ ہماری ملاقات تقریباً دو گھنٹہ تک جاری رہی۔ اپنے کام کے حوالے سے انہوں نے کوئی بلند بانگ دعویٰ کئے

For more books visit www.4Urdu.com

بغیر اپنے طریق کار پر بڑی فصاحت اور انکساری سے جو روشنی ڈالی' میرے لیے وہ کاروباری دنیا میں ایک نئے اور اچھوتے انداز کا فلسفہ تھا۔ ان کی گفتگو سے میں نے جو تاثر لیا' وہ کچھ یوں تھا۔

URDU4U.COM

بینک ہو یا فیکٹری' کاروباری ادارے ہوں یا کمپنیاں ان میں سرمایہ کاری کا بنیادی مقصد منافع کمانا ہوتا ہے۔ منافع کی کمی بیشی اس ادارے کی کامیابی یا ناکامی کا واحد پیمانہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ پیمانہ صحیح نہیں۔ کامیابی کا اصلی راز اس امر کے ساتھ وابستہ ہے کہ ادارے کے انتظامی اور انصرامی امور کے افراد (Management) مادی سرمایہ میں اخلاقی سرمایہ کس تناسب سے ملاتے ہیں۔ اگر یہ تناسب صحیح ہو' تو انصرام میں مادی اور اخلاقی اقدار کا امتزاج ایک سچی کامیابی کو جنم دیتا ہے۔

مینجر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی نفسیات میں پوری طرح گھل مل جائے' یا ان کی نفسیات کو خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ کرے۔ اس عمل سے مینجر اور اس کے رفقاء الگ الگ فرد نہیں رہتے' بلکہ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ ایک ادارہ بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے انصرامی انتظامیہ کا بالا دست گورننگ بورڈ صرف بورڈ روم کی چار دیواری میں مقید نہیں رہتا' بلکہ سارے کا سارا بورڈ ہر سطح پر ایک فعال کارکن کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس عمل سے اختیارات کی مرکزیت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہر سطح پر اختیارات کا خود اپنا مرکز بن جاتی ہے۔ اس بندوبست کی کامیابی کا گر لامرکزیت ہے۔

مینجر میں محض فہم ہی نہیں بلکہ فراست کا موجود ہونا لازمی ہے۔ اگر اس کی فراست حالیہ ماحول اور مقصدیت کے محدود دائرے سے نکل کر آگے پھیل جائے تو مستقبل کے امکانات کے علاوہ زندگی کا اعلیٰ مقصد بھی اس پر عیاں ہونے لگتا ہے۔ اس سے محدود مقصد اور لامحدود امکانات میں حقیقت پسندانہ توازن بھی قائم ہو کر برقرار رہتا ہے۔

وہ مینجر ناکام ہے جو اپنے سے بہتر اپنا جانشین تیار نہیں کرتا۔

صرف مالی منافع کمانا کافی نہیں۔ اس کے ساتھ روحانی منافع کمانا بھی ضروری ہے۔

For more books visit www.4Urdu.com

روحانی منافع صرف اس صورت میں وجود میں آتا ہے۔ جب ہم سچائی سے یہ کہہ سکیں کہ ہم نے اپنی جانب سے دیا تو زیادہ ہے اور دوسروں سے حاصل کم کیا ہے۔

URDU4U.COM

روحانی منافع عجز اور انکساری کو فروغ دیتا ہے اور دل میں دوسروں کو دینے کی امنگ ابھارتا ہے۔ دنیا ذات الٰہی کی صفت ہے۔ اس صفت کو اپنانے سے قلب' ضمیر اور روح میں ایک عجیب نور جگمگانے لگتا ہے۔

دوسروں کو دینے کا راستہ کشادہ کرنے کی ذمہ داری بی سی سی آئی فاؤنڈیشن کے دائرہ کار میں شامل ہے۔ فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام انواع و اقسام کے فلاحی ادارے چل رہے ہیں۔ کہیں پر ہسپتال' کہیں محروم اور نادر بچوں کے لیے اعلیٰ سکول' کہیں ایسی کمیٹیاں جو بیمار یا معذور یا مرحوم ادیبوں' فنکاروں اور کھیل کے میدان میں نام پیدا کرنے والے کھلاڑیوں کے خاندانوں یا پسماندگان کے لیے طرح طرح کی مالی امداد فراہم کرتی ہیں۔ جس ملک میں بینک کی برانچ جس قدر منافع کماتی ہے۔ اس کا ایک مقررہ حصہ اسی ملک کے اس طرح کے فلاحی اداروں پر ضرور صرف کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ بینک کے ۱۰۰۰ ملازمین کو ہر برس پورے سال کی تنخواہ کی ۲ ۱/۲ سے ۳ ۱/۲ فیصد تک اضافی رقم بھی اس شرط پر ادا کی جاتی ہے کہ وہ اسے اپنی ذات پر خرچ نہیں کریں گے بلکہ دوسروں کے کام میں لائیں گے۔ کوئی ملازم اس کو کس حد تک پورا کرتا ہے' اس کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ نہیں کی جاتی۔ یہ معاملہ شخص کے اپنے ضمیر اور اعتماد پر چھوڑ دیا جاتا ہے' تاکہ بینک کے ملازمین میں دوسروں کو دینے کی عادت ڈالنے کی ترغیب دی جائے۔

جس وقت یہ طویل ملاقات ختم ہوئی تو شام کے ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ بینک کی دس گیارہ منزلہ عمارت سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سب لوگ گھر جا چکے تھے۔ آغا حسن عابدی کے عملے کا صرف ایک افسر موجود تھا۔ آغا صاحب مجھے لفٹ تک چھوڑنے آئے اور اپنے افسر کو میرے ساتھ نیچے بھیجا کہ وہ مجھے بینک کی کار میں بٹھا کر میری قیام گاہ تک پہنچانے کا بندوبست کر آئے۔

For more books visit www.4Urdu.com

میری قیام گاہ وہاں سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر تھی۔ سڑکوں پر لندن کی شام کا ٹریفک سیلاب کی طرح امڈا ہوا تھا اور میں کار میں بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ آغا حسن عابدی سرمایہ داروں کے جھرمٹ میں درویشی کی تعلیم دے رہے ہیں یا درویشوں کی منڈلی میں سرمایہ داری کا بیج بو رہے ہیں!

آغا صاحب کے ایک ہمدم دیرینہ ابن حسن برنی کے ساتھ میری بیس بائیس برس پرانی دوستی ہے۔ پہلے وہ حبیب بنک میں ملازم تھے۔ بوریوالا ٹیکسٹائل مل حبیب بینک کے پاس آئی' تو اس کے جنرل مینجر مقرر ہوئے۔ یونائیٹڈ بینک کی بنیاد پڑی تو آغا صاحب انہیں اپنے ساتھ یو۔ بی۔ ایل لے گئے۔ آج کل بی۔ سی۔ سی اینڈ آئی کے لندن ہیڈکوارٹر میں ایک اہم اسامی پر تعینات ہیں۔

برنی صاحب محض بینکنگ کے تجربہ کار ماہر ہی نہیں بلکہ ایک نہایت اعلیٰ اور شائستہ ادبی ذوق کے مالک بھی ہیں' جو ان کو ورثہ میں ملا ہے۔ ان کے والد مرحوم سید حسن برنی صاحب ایک کامیاب وکیل ہونے کے علاوہ ایک صاحب طرز ادیب بھی تھے۔ اپنے زمانے کے اخبارات اور رسائل میں علمی' ادبی' تاریخی اور تمدنی موضوعات پر ان کے مضامین کثرت سے چھپتے رہتے تھے۔ ان مضامین کو دلچسپی اور افادیت کے پیش نظر انجمن ترقی اردو نے کافی محنت اور ریسرچ سے ان کا کھوج لگا کر انہیں دو جلدوں میں مرتب کیا۔ پہلی جلد "مقالات برنی" کے عنوان سے انجمن کے تحت شائع ہو چکی ہے۔ دوسری جلد کی تکمیل پر بھی کام ہو رہا ہے۔ یہ مضامین اردو زبان کے ایک خاص دور کے اسلوب بیان اور ماضی اور حال کی سیاست' ثقافت اور شرافت کا دلچسپ تقابلی مرقع ہیں۔

مشہور زمانہ "قادیانی مذہب" نامی کتاب کے مصنف الیاس برنی بھی برنی صاحب کے نہایت قریبی عزیز تھے۔ اس علمی اور ادبی ماحول میں آنکھ کھول کر ابن حسن برنی نے بھی طالبعلمی کے زمانے میں لکھنے لکھانے کا شوق کسی حد تک نبھایا۔ لیکن کارکنان قضا و قدر نے ان کا نام بینکنگ کے کھاتے میں ڈال رکھا تھا۔ جب نوابزادہ لیاقت علی خاں متحدہ ہندوستان کی عبوری حکومت میں وزیر خزانہ تھے' تو انہوں نے برنی صاحب کو مشورہ دیا

For more books visit www.4Urdu.com

کہ حبیب بینک پڑھے لکھے مسلمان نوجوانوں کو پاکستان میں بینکاری کا نظام سنبھالنے کی تربیت دے رہا ہے۔ انہوں نے یہ مشورہ بسروچشم قبول کر لیا' اور بمبئی جا کر حبیب بینک میں بھرتی ہو گئے۔ لیکن پینتیس چھتیس برس کی انتہائی مصروف اور کامیاب بینکر کی زندگی نے ان کے علمی اور ادبی ذوق پر کوئی زنگ نہیں لگنے دیا۔ وہ اب بھی نہایت شگفتہ نثر اور اچھی نظمیں لکھنے کی عمدہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ ابن انشا کی پہلی برسی پر لندن کے "جنگ" ایڈیشن میں "پھر ترا وقت سفر یاد آیا...." کے عنوان سے ان کا جو مضمون شائع ہوا تھا وہ آسانی سے فراموش ہونے والی تحریر نہیں۔ ایک روز انہوں نے لندن میں اپنی بیاض کے کچھ حصے مجھے تخلیہ میں سنائے تھے ان میں بیان کا نکھار اور خیالات کی پختگی اور گہرائی تھی۔ میں نے بہت زور دیا کہ ان کی بیاض کے کچھ حصے ضرور شائع ہونے چاہئیں' لیکن وہ نہ مانے۔ خدا کرے کسی روز مان جائیں۔

برنی صاحب پابند صوم و صلوٰہ ہی نہیں بلکہ دفتر کی گونا گوں مصروفیات میں بھی چپکے سے اٹھ کر کسی خاموش کونے میں جا کر نماز ادا کر آتے ہیں۔ حج کا فریضہ ادا کرنے کے علاوہ عمرہ کی سعادت بھی کئی بار حاصل کر چکے ہیں۔ لندن اور دوسرے مغربی ممالک میں بھی حلال یا غیر حلال گوشت کی تمیز روا رکھتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پروان چڑھنے والے منصوبوں کے طفیل بے شمار نادار مریض شفایاب ہو رہے ہیں' بہت سے سوگوار خاندان سکون کی زندگی گزار رہے ہیں' یتیم بچوں کی تعلیم جاری رکھنے کے بندوبست ہو رہے ہیں اور یتیم بچیوں کی شادی کے اخراجات میں فیاضی سے حصہ لیا جا رہا ہے اور بے شمار بیواؤں کے ماہانہ گزارہ الاؤنس بھی مقرر ہیں۔ اس وسیع پیمانے پر ایسے فلاحی اور امدادی اقدامات کی کوئی تشہیر نہیں کی جاتی۔ ان کی بیاض کی طرح ان کی انتظامی اور فلاحی کارگزاریاں بھی صیغہ راز ہی میں رہتی ہیں۔ لیکن خدائے رحیم و کریم اور خالق علیم و بصیر سے یہ کار خیر کس طرح چھپا رہ سکتا ہے؟

پنجاب کے ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کی حیثیت سے اے حمید' آٹا پیسنے کی چکی والا محمد دین'

For more books visit www.4Urdu.com

آغا حسن عابدی اور ابن حسن برنی کے ساتھ میری ملاقات اسے زمانے کی خوشگوار یادیں ہیں۔ باقی متروکہ صنعتوں کی الاٹمنٹوں کا سارا کام ایک متعفن دلدل کی ناگوار سڑانڈ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

URDU4U.COM

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• گورنر جنرل ملک غلام محمد

۲۷ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو میں ایک میٹنگ کے سلسلے میں لاہور سے کراچی گیا ہوا تھا۔ میٹنگ شروع ہوتے ہی ٹیلیفون آیا کہ کیبنٹ سیکرٹری مسٹر عزیز احمد مجھے اپنے دفتر میں بلا رہے ہیں۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا' تو انہوں نے کہا کہ گورنر جنرل مسٹر غلام محمد تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ تم ابھی گورنر جنرل ہاؤس چلے جاؤ۔

غلام محمد صاحب کے ساتھ میری بالکل کوئی واقفیت نہ تھی۔ وزیر خزانہ کے طور پر انہیں فقط چند بار دیکھا تھا۔ میں نے مسٹر عزیز احمد سے اس بلاوے کا مقصد دریافت کیا تو انہوں نے اپنی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔

غلام محمد صاحب کے ایک بھائی نے لاہور کسی فیکٹری کی الاٹمنٹ کے لیے درخواست دی ہوئی تھی۔ مجھے گمان گزرا کہ شاید گورنر جنرل اس سلسلے میں کوئی سفارش کرنے والے ہوں۔ میں نے اپنے اس خدشے کا مسٹر عزیز احمد سے ذکر کیا' تو انہوں نے اس سے بھی اپنی مکمل لاتعلقی کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ مسٹر غلام محمد سٹک طبیعت کے آدمی ہیں۔ اس لیے میں ان کے ساتھ بات چیت میں احتیاط سے کام لوں۔

مسٹر عزیز احمد کا مشورہ پلے باندھ کر میں گورنر جنرل ہاؤس پہنچا۔ ایک اے ڈی سی مجھے اپنے ساتھ اوپر والی منزل میں لے گیا۔ وہاں پر برآمدے میں قالین بچھا ہوا تھا اور اس پر صوفے لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک گول میز پر بڑے خوبصورت پھول سجے ہوئے تھے۔ مسٹر غلام محمد ایک گدے والی آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے نیلے رنگ کا دھاریدار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ رومال اور جرابیں ٹائی کے ہمرنگ تھیں۔ کوٹ کے کالر میں گلاب کا پھول ٹنگا تھا۔ سر پر کالی جناح کیپ تھی۔ ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ ان کے قریب والی کرسی پر گورنر جنرل کی پرسنل پرائیویٹ سیکرٹری مس روتھ بورل بیٹھی تھی۔ یہ بڑی

For more books visit www.4Urdu.com

طرحدار' نازک اندام' خوبصورت' نیم امریکن' نیم سوس لڑکی تھی' جسے وہ واشنگٹن سے منتخب کر کے اپنے ساتھ پاکستان لائے ہوئے تھے۔ مس بورل پر نگاہ پڑتے ہی میں نے دل ہی دل میں مسٹر غلام محمد کے حسن انتخاب کی داد دی۔

URDU4U.COM

اے ڈی سی نے میری آمد کا اعلان کیا تو دونوں نے نظریں گاڑ کر مجھے سر سے پاؤں تک گھورا۔ اس کے بعد مسٹر غلام محمد نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ چند لمحے عجیب سی خاموشی طاری رہی۔ پھر گورنر جنرل نے بچوں کی طرح غوں غاں کر کے کچھ بولنا شروع کیا۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح بولتے رہے' لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کس زبان میں گفتگو کر رہے ہیں۔

جب وہ خاموش ہوئے تو مس بورل بولی۔ "ہزایکسیلینسی فرماتے ہیں کہ انہوں نے آپ کو سیکرٹری ٹو گورنر جنرل کی پوسٹ کے لیے منتخب کیا ہے۔ اس نازک زمانے میں یہ بڑی اہم ذمہ داری ہے۔ ایچ ای امید رکھتے ہیں کہ آپ ان کے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کریں گے۔ ایچ ای کا حکم ہے کہ آپ ابھی نیچے جائیں اور اپنی پوسٹ کا چارج سنبھال لیں۔"

یہ سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ صاف انکار کرنا تو مشکل تھا' اس لیے میں نے ایک عذر لنگ پیش کرنے کی کوشش کی۔ "میں اس وقت پنجاب گورنمنٹ میں ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کے طور پر کام کر رہا ہوں۔ جب تک صوبائی حکومت مجھے وہاں سے فارغ نہ کرے کسی اور پوسٹ کا چارج لینا بڑی بے ضابطگی ہو گی۔"

یہ بات سن کر مسٹر غلام محمد غصے میں آ گئے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور انہوں نے کڑک کر کچھ دیر پھر غوں غاں کی' جس کا مفہوم مس بورل نے مجھے یوں سمجھایا۔ "ہزایکسیلینسی فرماتے ہیں پنجاب گورنمنٹ جہنم میں جائے۔ جس بے ضابطگی کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ بھی آپ کے سمیت جہنم میں جائے۔ پنجاب کے چیف منسٹر ملک فیروز خاں نون اتفاق سے نیچے بیٹھے ہیں۔ انہیں ابھی یہاں بلایا جا رہا ہے تاکہ وہ آپ کو پنجاب سے فارغ کر دیں۔ اس کے بعد آپ فوراً نیچے جا کر اپنی پوسٹ کا چارج سنبھال لیں۔"

For more books visit www.4Urdu.com

یہ تیر نشانے پر نہ بیٹھا' تو میں نے ایک اور حربہ استعمال کیا۔ "جناب میری والدہ اور سامان لاہور میں ہے۔ چارج لینے سے پہلے میں وہاں جا کر انہیں کراچی لا سکتا ہوں؟"

URDU4U.COM

اب مسٹر غلام محمد کا پارہ بید اوپر چڑھ گیا اور وہ کرسی میں بل کھا کھا کر زور زور سے چیخنے لگے۔ ان کے منہ کے ایک کونے سے لعاب دہن کی پچکاری سی چلی اور کوٹ کی آستین پر گر گئی۔ مس بورل نے نیپکن سے ان کا کوٹ صاف کیا اور مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "ہزایکسیلینسی نے اپنی شدید خفگی کا اظہار کیا ہے کہ آپ حجت بہت کرتے ہیں۔ ایچ۔ ای کا حکم ہے کہ آپ اس ناپسندیدہ عادت کو فوراً ترک کریں ورنہ آپ کو پچھتانا پڑے گا۔"

یہ سین ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ ایک اے۔ ڈی۔ سی پنجاب کے چیف منسٹر ملک فیروز خاں نون کو لے کر برآمدے میں نمودار ہوا۔ ملک صاحب کو دیکھتے ہی مسٹر غلام محمد نے ہاتھ سے میری طرف اشارہ کیا اور غاؤں غاؤں کر کے کچھ بولتے رہے۔ مس بورل ترجمانی کے فرائض سر انجام دیتی رہی۔ اس کے بعد چیف منسٹر نے مجھے کہا۔ "یہ پوسٹنگ بڑے اعزاز کی بات ہے۔ مبارک ہو۔ فوراً چارج سنبھالو۔ باقی ضابطے کی کاروائیاں بعد میں ہوتی رہیں گی۔"

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تو چیف منسٹر نے آنکھ مار کر مجھے چپ کرا دیا۔ اس طرح سربراہ مملکت سے میرا پہلا انٹرویو ختم ہوا اور میں اگلے نو برس کے لیے اس بیت الجحن میں مقید ہو گیا۔

نیچے آ کر میں مسٹر اے۔ جی۔ رضا کے کمرے میں گیا' جو اس وقت گورنر جنرل کے سیکرٹری تھے۔ اس وقت تک غالباً انہیں کوئی علم نہ تھا کہ ان کا تبادلہ کر دیا گیا ہے اور ان کی جگہ میری تقرری ہو گئی ہے۔ یہ خبر انہوں نے شاید پہلی بار مجھ سے سنی۔ اس طرح بے خبری میں ناگہانی طور پور سیکرٹری بدلنے کا انداز مجھے بڑا بدنما اور نازیبا نظر آیا۔ کسی سربراہ مملکت کے شایان شان نہیں کہ وہ اپنے ماتحت عملے کے ساتھ ایسا سلوک

For more books visit www.4Urdu.com

روا رکھے۔ اس قسم کا طریق کار وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جن کا ذہن پیچدار اور سازشی ہو۔ جہاں تک میری تقرری کا تعلق ہے' میں نے تو اسے بلائے ناگہانی ہی سمجھا۔ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ مسٹر غلام محمد نے مجھے اس پوسٹ کے لیے کیوں چنا اور کس کے کہنے پر چنا۔ نومبر ۱۹۵۴ء کے اوائل میں میں نے اس پوسٹ کا چارج سنبھال لیا۔

گورنر جنرل ہاؤس کا ماحول آسیب زدہ سا نظر آتا تھا۔ چاروں طرف ایک غیر وجودی سا سناٹا چھایا ہوا تھا' جس میں گورنر جنرل' مس بورل' ملٹری سیکرٹری' اے ڈی سی' گارڈ کے سپاہی' چپراسی' بیرے اور خدمت گار اس طرح دکھائی دیتے تھے جیسے لکڑی کے متحرک ڈھانچوں کو زبردستی کپڑے پہنا دیئے ہوں۔ سیکرٹری کی پوسٹ کا چارج لینے کے بعد کئی روز تک میں خاموشی سے اس شخصیت کا جائزہ لیتا رہا' جس کے ساتھ اب مجھے دن رات پالا پڑنے والا تھا۔ مسٹر غلام محمد کافی عرصہ سے فالج کے مریض تھے۔ ان کا بلڈ پریشر مستقل طور پر بہت اونچا رہتا تھا۔ وہ چند قدم سے زیادہ چلے پھرنے سے قطعاً معذور تھے اور اکثر مریضوں والی پہیہ دار کرسی میں بیٹھ کر گورنر جنرل ہاؤس کا گشت کیا کرتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رعشہ تھا اور وہ اپنے دستخطوں کے علاوہ مزید کچھ لکھنے کے ناقابل تھے۔ فالج نے ان کی زبان اور چہرے کو بھی متاثر کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کی گفتگو کسی کو سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ان کے دہن کا عضلاتی نظام اس قدر کمزور ہو گیا تھا' کہ جب وہ کھانے پینے کی کوئی چیز منہ میں ڈالتے تھے' تو اس کا کچھ حصہ دونوں کونوں سے باہر گرتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں جب کوئی غیر ملکی سفیر اپنی اسناد پیش کرنے آتا تھا تو اسے گورنر جنرل کے ساتھ لنچ بھی کھلایا جاتا تھا۔ سٹاف کے ممبر بھی لنچ میں شریک ہوتے تھے۔ جس وقت مسٹر غلام محمد لقمہ منہ میں ڈال کر سفیر کے ساتھ گفتگو فرمانے کی کوشش کرتے تھے' وہ سماں بڑا عبرتناک ہوتا تھا۔

ان جسمانی عوارض کے علاوہ مسٹر غلام محمد کا ذہن بھی گنڈے دار تھا اور کسی قدر وقفے اور ناغے سے تھم تھم کر کام کرنے کا عادی تھا۔ کبھی تو ان کا دماغ بالکل صاف'

For more books visit www.4Urdu.com

شفاف اور تیز و طرار ہوتا تھا اور وہ ہر چیز کو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سمجھ لیتے تھے۔ لیکن کبھی وہ بلب کی طرح فیوز ہو کر مختل ہو جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ کبھی بچوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے تھے' کبھی بالکل دیوانے نظر آتے تھے۔

ذہن کی طرح ان کا مزاج بھی پل میں تولہ پل میں ماشہ ہوتا رہتا تھا۔ کبھی گرم' کبھی سرد' کبھی نرم' کبھی سخت۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان کے مزاج کی گرمی اور سختی میں آمد کم ہوتی تھی اور آورد زیادہ۔ وہ دوسرے پر رعب گانٹھنے کے لیے' یا محض تفنن طبع کے طور پر گیدڑ بھبکیوں سے کام لینا شروع کرتے تھے۔ آواز بلند کر کے اپنے اوپر بناوٹی غصہ طاری کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس عمل کے دوران رفتہ رفتہ بلڈ پریشر کا عفریت ان کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتا تھا اور اصلی غصہ ان کے حواس پر قابو پا لیتا تھا۔ ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتی تھی اور وہ چیخ چیخ کر نڈھال ہو جاتے تھے۔

اس نوعیت کے نظارے بڑے ناگفتہ بہ ہوتے تھے۔

کرنل سرور اور ڈاکٹر حفیظ اختر صاحب گورنر جنرل کے سٹاف پر ان کے ذاتی معالج تھے۔ ڈاکٹر حفیظ اختر ہر صبح گورنر جنرل کا طبی معائنہ کر کے جب نیچے آتے تھے تو ہم ان کے چہرے بشرے اور محتاط سوال جواب سے یہ اندازہ لگا لیا کرتے تھے کہ ہمارا آج کا دن کیسا گذرے گا۔ اگر معلوم ہوتا تھا کہ گورنر جنرل کی طبیعت زیادہ نڈھال ہے' تو ہمارا نخل تمنا ہرا ہو جاتا تھا کیونکہ ملک غلام محمد کا نیچے آ کر اپنے اسٹاف پر مار دھاڑ کرنے کا احتمال باقی نہیں رہتا تھا۔ اس کے برعکس اگر ڈاکٹر حفیظ اختر کی چال ڈھال سے اندازہ لگتا تھا کہ گورنر جنرل کی طبیعت بحال ہے تو ہمار نخل تمنا یکایک مرجھا جاتا تھا۔ چنانچہ کام شروع کرنے سے پہلے ہم ڈاکٹر حفیظ اختر کے نیچے اترنے کا بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے تاکہ ہم اس روز کے رنگ ڈھنگ کا قیاس کر کے صورت حال سے نمنٹنے کے لیے کمر بستہ ہو جائیں۔

مسٹر غلام محمد کے کردار میں کسی قسم کی کوئی آئیڈیل ازم نہ تھی۔ ان کے مقاصد میں

For more books visit www.4Urdu.com

اولیت کا شرف ہوس اقتدار کو حاصل تھا۔ دوسرے درجہ پر صنف نازک کی طرف ان کا شدید رجحان تھا جو اکثر مریضانہ حد تک پہنچ جایا کرتا تھا۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے وہ خود غرضی' خودسری' ہٹ دھرمی دھونس' دھاندلی اور اپچ پیم کے سمیت ہر قسم کا حربہ استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے جن لوگوں نے ان کے ساتھ وزیراعظم لیاقت علی خان کی کابینہ میں کام کیا تھا' ان پر مسٹر غلام محمد کے کردار کے یہ سب پہلو روز روشن کی طرح عیاں تھے۔ یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی جب انہیں بستر علالت سے اٹھا کر گورنر جنرل کی کرسی پر بٹھا دیا گیا تو یہ ایک ایسی غلطی کا ارتکاب تھا جس کا خمیازہ پاکستان آج تک بھگت رہا ہے۔

یہ مفلوج' معذور اور مغرور شخص ایسی مٹی سے بنا ہوا نہیں تھا کہ گورنر جنرل کے سنہری اور آئینہ پنجرے میں بند ہو کر صبر و شکر سے بیٹھا رہے۔ ڈیڑھ برس کے اندر اندر اپریل ۱۹۵۳ء میں اس نے قلم کی ایک جنبش سے خواجہ ناظم الدین کو ملک کی وزارت عظمیٰ سے موقوف کر دیا۔ ابھی چند روز قبل خواجہ صاحب کا بجٹ قومی اسمبلی نے بھاری اکثریت سے منظور کیا تھا۔ مسٹر غلام محمد کے اس آمرانہ عمل نے پاکستان میں جمہوریت کی بنیاد کو پہلی بار ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اگر مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی میں کچھ دم خم ہوتا تو اس کا فرض تھا کہ وہ گورنر جنرل کے اقدام کی مذمت کر کے خواجہ ناظم الدین میں اپنے اعتماد کی توثیق کر دیتی۔ لیکن مسلم لیگ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے منہ پر یہ چپت بھیگی بلی بن کر قبول کر لی اور گورنر جنرل کے نامزد وزیراعظم محمد ولی بوگرہ کو بڑی فرمانبرداری سے اپنا لیڈر منتخب کر لیا۔ آٹھ دس ماہ بعد ۱۹۵۴ء کے اوائل میں جب مشرقی پاکستان میں انتخابات منعقد ہوئے تو اس میں مسلم لیگ کو شکست فاش ہوئی اور ۲۳۷ مسلم نشستوں میں سے ۲۲۳ جگتو فرنٹ نے جیت لیں اور صرف دس نشستیں مسلم لیگ کے ہاتھ آئیں۔ اب مشرقی پاکستان سے یہ مطالبہ ہونے لگا کہ موجودہ مرکزی قانون ساز اسمبلی عوام کی صحیح نمائندگی کا حق ادا کرنے کے قابل

For more books visit www.4Urdu.com

نہیں رہی۔ لہٰذا اس کے لیے بھی نئے انتخابات ہونے چاہئیں۔ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کا حشر دیکھ کر مرکزی اسمبلی کے مسلم لیگی نمائندے نے انتخابات کے نام ہی سے کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ اب انہیں یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ کہیں گورنر جنرل سچ مچ ہی مرکزی اسمبلی کو برخاست کر کے نئے انتخابات کا ڈول نہ ڈال دیں۔ اس کے علاوہ خواجہ ناظم الدین کی ناجائز برطرفی کا کانٹا بھی اب سترہ ماہ بعد اچانک ان کے حساس دل میں چبھنے لگا تھا۔ چنانچہ ۲۱ ستمبر ۱۹۵۴ء کو آئین ساز اسمبلی نے گورنر جنرل کے وہ تمام اختیارات چھین لیے جنہیں استعمال کر کے وہ وزیراعظم یا کابینہ کو معطل کر سکتے تھے۔

گورنر جنرل کے اختیارات کم کرنے کا جو قدم اسمبلی نے اٹھایا' وہ نہایت مناسب اور صحیح تھا لیکن جس طریقے سے یہ قدم اٹھایا گیا وہ مضحکہ خیز تھا۔ اسمبلی کے ممبر مفلوج غلام محمد سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ انہوں نے یہ کاروائی چوروں کی طرح دبے پاؤں چھپ چھپا کر کی۔ ترمیمات کا ریزرویشن چھپوا کر ممبروں کو فوراً تقسیم نہ کیا گیا بلکہ آدھی رات کو اسمبلی میں ان کے پچن ہولوں میں رکھوا دیا گیا۔ اگلی صبح اسمبلی کا اجلاس مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ قبل شروع ہوا اور گورنر جنرل کے اختیارات کم کرنے کا ریزرویشن دس منٹ کے اندر اندر پاس ہو گیا۔ اس قرارداد کے بعد مسٹر غلام محمد کی پوزیشن بالکل کابینہ اور اسمبلی کے رحم و کرم پر منحصر ہو گئی۔ اس شب خون کا جواب گورنر جنرل نے ۳ دن کے بعد دیا اور ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو اچانک ملک بھر میں ہنگامی حالات کا اعلان کر کے قانون ساز اسمبلی کو برخاست کر دیا' کابینہ برطرف کر دی اور مسٹر محمد علی بوگرا کی سرکردگی میں اپنی مرضی کی ایک نئی کیبنٹ تشکیل دے دی۔ مسٹر غلام محمد کے اس اقدام نے پاکستان میں جمہوریت کا رہا سہا بھرم بھی پامال کر دیا اور ذاتی اقتدار کی ہوس پر آئینی اور قانونی اصولوں کو بے دریغ پامال کرنے کی ایسی مثال قائم کی جس نے آگے چل کر ایسے سدا بہار گل کھلائے جو آج تک مرجھانے کا نام تک نہیں لیتے۔

For more books visit www.4Urdu.com

قانون کی عظمت اور آئین کی حرمت چادر عصمت کے مترادف ہے۔ یہ اگر ایک دفعہ چاک ہو جائے تو اسے رفو کرنا انسان کے اختیار میں نہیں رہتا۔ ایک لغزش دوسری لغزش کا پیش خیمہ بن جاتی ہے اور اگر عقوبت کا تازیانہ شروع ہی میں اس کا راستہ نہ روکے' تو ارتکاب جرم عادت ثانیہ بن جاتی ہے اور رفتہ رفتہ راج نراج' حکومت اور طوائف الملوکی' قانون اور بد نظمی' آئین اور آمریت کے فرق کا ادراک کمزور ہو جاتا ہے۔ نظام حکومت سے آئینی شائستگی رخصت ہو جاتی ہے اور نظم و نسق میں عدل و انصاف کا عنصر ماند پڑ جاتا ہے۔ آئین کا تقدس ختم ہو کر اس کی حیثیت ایک سرکاری سرکلر کے برابر رہ جاتی ہے' جسے وقتی یا ذاتی مصلحتوں کے مطابق توڑا مروڑا جا سکتا ہے' معطل کر کے معرض التوا میں ڈالا جا سکتا ہے' یا بالکل منسوخ کر کے کالعدم قرار دیا جا سکتا ہے۔ ملک کے دستور کا جب یہ حشر ہونے لگے تو دوسری بہت سی قابل احترام روایات اور اقدار کا تقدس بھی اسی تناسب سے کم ہونے لگتا ہے۔ سیاست کا عمل رک جاتا ہے' یا روک دیا جاتا ہے' یا غلط رخ اختیار کرنے لگتا ہے۔ سیاست کا میدان مثل باغیچہ ہے۔ اس کی نشوونما کا عمل جاری رہے تو پھول اور کانٹے اپنے اپنے تناسب سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر آبیاری بند ہو جائے تو جھاڑ جھنکار کے علاوہ اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ ایسے حالات میں آئیڈیلزم کی جڑیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ جذبہ وطنیت و قومیت کے فروغ میں وہ پہلا سا جوش و خروش باقی نہیں رہتا۔ بے یقینی' تذبذب اور شکوک و شبہات کی فضا میں سانس لے کر معاشرہ کلبیت اور یاسیت کا شکار ہونے لگتا ہے یا تخریب کاری کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ آئینی نظام کا نعم البدل صرف آئینی نظام ہے۔ اس کے علاوہ سب دعوے باطل ہوتے ہیں اور عام طور پر چند محدود عناصر کے ذاتی مفادات کی فریب کاری کا نتیجہ ثابت ہوتے ہیں۔

مسٹر غلام محمد اپنے سہارے چل پھر سکتے تھے' نہ کچھ لکھ سکتے تھے' اور نہ ہی ان کی بات کوئی آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔ ان تمام معذوریوں کے باوجود انہوں نے ملک بھر

For more books visit www.4Urdu.com

میں ہنگامی حالات کا اعلان کس برتے پر کیا؟ فیلڈ مارشل ایوب خاں نے اپنی کتاب "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" میں لکھا ہے کہ ہنگامی حالات کا اعلان ہونے سے پہلے وہ پرائم منسٹر محمد علی بوگرا' چوہدری محمد علی اور اسکندر مرزا کے ساتھ امریکہ گئے ہوئے تھے۔ وہاں پر وزیراعظم کو گورنر جنرل کا پیغام ملا کہ فوراً واپس آؤ۔ یہ پیغام پا کر ان سب نے جلد سے جلد واپس آنے کی ٹھان لی۔ جب وہ لندن پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس روز کوئی ہوائی جہاز مشرق کی طرف نہیں جا رہا۔ اس لیے انہوں نے کراچی کے لیے ایک ہوائی جہاز چارٹر کر لیا۔ اس کے بعد واقعات ایوب خاں کے اپنے الفاظ میں اس طرح رونما ہوئے:

لندن ائیر پورٹ پر گورنر جنرل نے مجھے ٹیلیفون پر بلوایا۔ لیکن ان کی بات میری سمجھ میں بالکل نہ آئی' میں نے ٹیلیفون اسکندر مرزا کو دے دیا۔ ہمیں بس اسی قدر معلوم ہو سکا کہ گورنر جنرل مجھے فوراً پاکستان بلانا چاہتے ہیں۔ انہیں دوسروں سے غرض نہ تھی.....

اسکندر مرزا اور چودھری محمد علی اور میں' ہم تینوں گورنر جنرل کی کوٹھی پر پہنچے..... گورنر جنرل اوپر کی منزل پر اپنی خوابگاہ میں لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے خون کا دباؤ بڑھ گیا تھا اور پیٹھ میں بڑی سخت تکلیف تھی۔ جس کی وجہ سے وہ سیدھے ایک تختے پر چاروں شانے چت لیٹنے پر مجبور تھے۔ وہ غصے سے آگ بگولہ ہو رہے تھے اور گالیوں کی بوچھاڑ تھی کہ تھمنے کا نام نہ لیتی تھی لیکن خوش قسمتی سے یہ گالیاں کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ چودھری محمد علی نے جرات کر کے کچھ کہا' اس کے جواب میں ان پر بوچھاڑ پڑی۔ اس کے بعد اسکندر مرزا کچھ بولے' ان پر بھی بوچھاڑ پڑی۔ ہم ان کی خدمت میں یہ گزارش کرنا چاہتے تھے کہ آپ (وزیراعظم" محمد علی (بوگرا" کو ایک موقع اور دیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے غرا کر کہا "جاؤ۔ جاؤ۔ دور ہو جاؤ۔" ان کی زبان سے بار بار "نہیں' نہیں" کے الفاظ نکلتے تھے' وہ بس ہم کو بھگا دینا چاہتے تھے۔

ہم ایک کے پیچھے ایک ان کی خواب گاہ سے نکلے۔ آگے آگے اسکندر مرزا' ان کے

For more books visit www.4Urdu.com

پیچھے چوہدری محمد علی اور سب سے پیچھے میں۔ میں کمرے سے باہر قدم رکھنے ہی کو تھا کہ اس نرس نے جو ان کی خدمت پر مامور تھی' میرا کوٹ پکڑ کر کھینچا۔ میں پلٹا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میں ایک بالکل مختلف آدمی سے دو چار ہوں۔ یہی ہمارے بیمار اور بوڑھے گورنر جنرل جو لحہ بھر پہلے غصے سے دیوانے ہو رہے تھے' اب ان کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا تھا اور وہ قہقہے لگا رہے تھے۔ میں نے دل میں کہا "آپ بھی بڑے حضرت ہیں۔" انہوں نے ایک خاص مسرت کی چمک آنکھوں میں لیے مجھے اشارہ کیا۔ "میری پر بیٹھ جاؤ۔"

اس کے بعد انہوں نے تکیے کے نیچے سے دو دستاویزیں نکالیں۔ ان میں سے ایک پر کچھ اس قسم کی عبارت تھی کہ "میں' غلام محمد فلاں فلاں وجوہ کی بنا پر فلاں فلاں اختیارات جنرل ایوب خاں کو سونپتا ہوں اور انہیں حکم دیتا ہوں کہ وہ تین مہینے کے اندر اندر آئین تیار کریں۔" میں نے اس کاغذ پر نظر ڈالی اور دل میں کہا۔ "خدا آپ سے سمجھے۔ پچھلے آٹھ برس تو آپ کو ہوش نہ آیا اور اب آپ چاہتے ہیں کہ میں تین مہینے میں دستور بنا کے پیش کر دوں۔"

دوسری دستاویز اس مضمون کی تھی کہ میں نے اس پیشکش کو قبول کر لیا ہے۔ لحہ بھر کے لیے میں ان تاریخی دستاویزوں کو اپنے ہاتھ میں تھامے رہا۔

جیسے ہی میں نے ان کاغذوں پر نظر ڈالی میرا تن بدن پکار اٹھا کہ "نہیں' ہرگز نہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ جلد بازی سے کام لے رہے ہیں۔ اس سے ملک کو سخت نقصان پہنچے گا۔ میں فوج کی تعمیر میں مصروف ہوں۔ ہمارا ایک دشمن ہے ہندوستان' جس کو رام کرنا بڑا دشوار ہے۔ ہم ہزار چاہیں کہ وہ ہمیں دشمن نہ سمجھے مگر وہ دشمن سمجھنے پر تلا ہوا ہے۔ میں اپنے پیشے میں رہ کر ملک کی بہتر خدمت کر سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں کچھ مفید کام سر انجام دے سکتا ہوں۔ آپ اپنی موجودہ ذہنی کیفیت میں کوئی بات کر گزرنا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ آگے چل کر سوائے ملک کے نقصان کے اور کچھ نہیں ہو گا۔"

For more books visit www.4Urdu.com

اس کے جواب میں انہوں نے مجھ پر گالیوں کی ایک اور بوچھاڑ کر دی۔ لیکن انہیں احساس ہو گیا کہ میں اس جلد بازی کے کام میں ان کا ساتھ نہیں دوں گا۔

URDU4U.COM

جو کمانڈر انچیف اپنے گورنر جنرل کو ایسی کھری کھری باتیں سنانے کی ہمت رکھتا ہو' اس کا یہ فرض بھی تھا کہ وہ اسے کوئی اور غیر جمہوری اور غیر آئینی قدم اٹھانے سے باز رہنے کی تلقین بھی کرے۔ لیکن ایوب خاں نے مسٹر غلام محمد کو ایسی کوئی وارننگ نہ دی۔ بلکہ اس کے برعکس جب ہنگامی حالات کا اعلان ہوا اور اسمبلی کی برطرفی کے بعد نئی کابینہ بنی تو ایوب خاں نے کمانڈر انچیف کے عہدہ کے ساتھ ساتھ اس میں وزیر دفاع کا منصب بھی قبول کر لیا۔ اسکندر مرزا اس نئی کابینہ میں وزیر داخلہ مقرر ہوئے۔

ان دونوں حضرات کی رفاقت مسٹر غلام محمد کے لیے بڑی زبردست پشت پناہی تھی اور غالباً یہی وہ شہہ تھی جس کے زور پر انہوں نے اتنا بڑا قدم بھی اٹھایا تھا۔ اس زمانے میں اس کابینہ کو Cabinet of Lent کہا جاتا تھا۔ وطن عزیز ایسے جوہر نایاب سے خالی نہیں' جو صرف ہنگامی حالات میں اپنا جوبن دکھاتا ہے اور کابینہ میں شامل ہو کر ملک کی خدمت کرنے میں ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیتا۔ یہ صورت حال آج تک جاری و ساری ہے۔

میرے چارج لینے کے چند روز بعد نومبر میں کراچی میونسپل کارپوریشن نے گورنر جنرل کو ایک استقبالیہ پر مدعو کیا۔ استقبالیہ سے چند گھنٹے قبل مجھے انٹیلی جنس کی ایک سپیشل رپورٹ موصول ہوئی' جس میں یہ خدشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ جب گورنر جنرل کارپوریشن کے استقبالیے میں شریک ہونے جائیں گے تو راستے میں شاید کچھ لوگ مظاہرہ کریں اور مخالفانہ نعرے لگائیں۔ میں اس رپورٹ کو فوراً مسٹر غلام محمد کے پاس لے گیا۔ اسے پڑھتے ہی ان کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ کچھ دیر سناٹے کے عالم میں رہے' پھر بولے کہ میں یہ رپورٹ لے کر وزیر داخلہ اسکندر مرزا اور وزیر دفاع ایوب خاں کے پاس جاؤں اور ان سے کہوں کہ وہ دونوں گورنر جنرل کے ساتھ ان کی گاڑی میں کراچی کارپوریشن چلیں۔

For more books visit www.4Urdu.com

اسکندر مرزا صاحب کے دفتر پہنچ کر میں نے انہیں انٹیلی جنس کی رپورٹ دکھائی اور گورنر جنرل کا پیغام سنایا تو وہ اپنے مخصوص انداز میں خی خی کر کے خوب ہنسے اور بولے۔

"بڈھا بہت زیادہ ڈر گیا ہے۔ اس قدر خوف کی بات نہیں۔ چلو ایوب سے چل کر بات کرتے ہیں۔"

اسکندر مرزا صاحب کی گاڑی میں بیٹھ کر ہم ایوب خاں کے پاس پہنچے۔ دونوں پہلے کچھ دیر آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے۔ پھر زور زور سے قہقہے لگا کر گورنر جنرل کی خوفزدگی کا مذاق اڑاتے رہے۔ پھر مجھ سے کہا کہ میں واپس جا کر مسٹر غلام محمد کو تسلی دوں کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ شوق سے کارپوریشن کے استقبالیہ میں تشریف لے جائیں۔

میں نے جواب دیا کہ گورنر جنرل میری زبانی بات پر زیادہ یقین نہ کریں گے۔ اگر وہ یہی بات لکھ کر دے دیں تو بہتر ہو گا۔

یہ سن کر اسکندر مرزا نے فوراً اپنا قلم نکالا اور انٹیلی جنس رپورٹ کے حاشیے پر ایک نوٹ لکھ دیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ میں گورنر جنرل کو مکمل یقین دلاتا ہوں کہ حالات پوری طرح قابو میں ہیں۔ وہ بے فکری سے کارپوریشن کے جلسے میں جائیں۔ راستے میں کوئی گڑبڑ نہ ہو گی۔

تیسرے پہر میں مسٹر غلام محمد کے ساتھ ان کی کار میں بیٹھا اور ہمارا قافلہ کراچی کارپوریشن کی طرف روانہ ہوا۔ ہمارے آگے پیچھے مسلح پولیس کی اتنی کثرت تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم استقبالیہ میں شریک ہونے نہیں جا رہے بلکہ کوئی مورچہ فتح کرنے جا رہے ہیں۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں' اور اکا دکا راہگیروں کو بھی پولیس والے لاٹھیوں سے کھدیڑ کر گلی کوچوں میں بھگا رہے تھے۔ راستے میں اس قدر امن و امان دیکھ کر مسٹر غلام محمد ایک دم شیر ہو گئے۔ انہوں نے اپنی چھڑی کا ہینڈل میری پسلیوں میں چبھو کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور انٹیلی جنس والوں کو موٹی گالی دے کر کہا۔ کہاں گئے میرے خلاف مظاہرہ کرنے والے؟ کہاں مر گئے میرے خلاف نعرے لگانے والے؟"

For more books visit www.4Urdu.com

میں نے پولیس کے انتظام کی کچھ تعریف کی تو انہوں نے پولیس والوں کو بھی بڑی سخت گالی دی اور اپنی چھاتی پر ہاتھ مار کر بولے۔ "میں کسی سے ڈرنے والا نہیں۔ اگر کوئی میرے سامنے آئے گا میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔ اگر کوئی میرے خلاف نعرہ لگائے گا' میں اس کے منہ پر تھوک دوں گا۔" اپنے اس عزم کا عملی مظاہر کرنے کی خاطر مسٹر غلام محمد نے کار میں زور سے تھوکا' جو اچٹ کر ان کے کوٹ کے کالر پر گرا۔ اے۔ ڈی۔ سی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے ایک نیپکن مجھے دیا۔ میں نے اس سے کوٹ کا کالر صاف کرنے کی کوشش کی تو مسٹر غلام محمد نے چھڑی گھما کر مجھے غور سے گھورا اور کہنے لگے۔ "تم کشمیری ہو نا؟ کشمیری ہا تو بڑے بزدل ہوتے ہیں۔ تم صبح سے سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ سڑک پر یہ ہو جائے گا۔ وہ ہو جائے گا۔ اب بولو کیا ہوا؟ غلام محمد کے سامنے کون کھڑا ہو سکتا ہے؟ تھو۔ تھو۔ تھو....." انہوں نے نفرت سے کئی بار تھوکا اور کارپوریشن کے لان تک پہنچتے پہنچتے بڑی مشکل سے ان کے کوٹ کالر اور آستین صاف کی گئی۔

مسٹر غلام محمد کا معمول تھا کہ وہ دن کے گیارہ بجے اپنے عملے کے کچھ افراد کو اپنے ساتھ چائے پر اکٹھا کیا کرتے تھے۔ کارپوریشن کے استقبالیہ کے بعد کئی روز تک وہ چائے پر میرا مذاق اڑا کر مجھے رگیدتے رہے کہ انٹیلی جنس کی رپورٹ دیکھ کر اس شخص کی گھگھی بندھی ہوئی تھی اور یہ کار میں اس طرح سہما ہوا بیٹھا تھا جس طرح چوہا بلی کے ڈر سے تھر تھر کانپتا ہے۔ تیسرے یا چوتھے روز انہوں نے مجھے مخاطب کر کے سوال کیا۔ "سچ سچ بتاؤ' ڈر کے مارے کار میں تمہار پیشاپ بھی خطا ہوا تھا یا نہیں؟"

میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ یور ایکسیلینسی' اس روز مجھ پر کوئی خوف طاری نہ ہوا تھا۔"

یہ جواب سن کر مسٹر غلام محمد سکتے میں آ گئے۔ پھر غصے سے بولے۔ "تمہارا مطلب ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

میں خاموش رہا۔

For more books visit www.4Urdu.com

"ہاں' ہاں۔" مسٹر غلام محمد چیخ کر بولے۔ تمہارا یہی مطلب ہے کہ میں جھوٹ بکواس کر رہا ہوں۔"

میں پھر خاموش رہا۔ بس اب کیا تھا۔ گورنر جنرل غصے میں آپے سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے چائے کی پیالی قالین پر پٹخ دی اور چیخ چیخ کر اس بات کا ماتم کرنے لگے کہ اب دو دو ٹکے کے سرکاری ملازم بھی سربراہ مملکت کے منہ پر جھوٹ بولنے کا الزام لگانے کی جرات کرنے لگے ہیں' جو ملک کے سربراہ کا وفادار نہیں وہ ملک کا وفادار نہیں۔

ایسے غداروں کے متعلق انہوں نے بڑی ہولناک سزائیں تجویز کیں اور ہم سب منہ لٹکائے اپنے اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد مس بورل میرے کمرے میں آئی اور میری ڈھارس بندھانے لگی کہ اس گھر میں ایسے واقعات وقتہ فوقتہ رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ان سے دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ مسٹر غلام محمد کی نفسیات پر تبصرہ کر ہی رہی تھی کہ اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور گورنر جنرل اپنی وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے اندر تشریف لائے۔ آتے ہی انہوں نے مس بورل سے پوچھا کہ وہ یہاں کیوں بیٹھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ وہ میرے آنسو پونچھنے آئی تھی' کیونکہ میں چائے والے واقعہ پر سخت شرمندہ تھا' اور اس وقت سے اب تک زار و قطار روتا رہا تھا۔

اچھا! مسٹر غلام محمد نے بچوں کی طرح خوش ہو کر پوچھا۔ "کتنا رویا ہے؟"

"بکٹ فل' ایکسیلنسی' بکٹ فل'۔" مس بورل نے ہاتھوں سے بڑی بالٹی کا سائز بنا کر کہا۔

"کیا یہ اب ایک پیالی چائے کا مستحق ہو گیا ہے؟" گورنر جنرل نے پوچھا۔

"ہاں ایکسیلنسی' چائے کے ساتھ کیک کا بھی۔" مس بورل نے کہا۔

"نہیں' کیک تم کھانا۔" مسٹر غلام محمد نے مچل کر کہا۔ "اس کو ہم صرف بسکٹ دیں گے۔"

اس مول تول کے بعد وہ دونوں مجھے اپنے ساتھ اوپر لے گئے۔ مسٹر غلام محمد نے چائے کے ساتھ مجھے گن کر صرف ایک بسکٹ دیا اور خود وہ کیک کی کریم انگلیوں سے چاٹ

For more books visit www.4Urdu.com

چاٹ کر کھاتے رہے۔

ایک رات میں اپنے گھر سویا ہوا تھا۔ آدھی رات کے قریب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میرا ڈپٹی سیکرٹری فرخ امین بول رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "آپ جس حالت میں ہیں اسی طرح فوراً گورنر جنرل ہاؤس آ جائیں۔"

URDU4U.COM

مسٹر غلام محمد بیمار تو رہتے ہی تھے۔ مجھے خیال گزرا کہ شاید اچانک انہیں کچھ ہو گیا ہے۔ میں نے فرخ امین سے پوچھا' بڑے میاں تو ٹھیک ہیں؟"

ٹیلیفون پر تھوڑی دیر کچھ کھسر پھسر سی ہوئی۔ پھر اس نے گول مول سا جواب دیا۔ "ہاں' لیکن آپ فوراً یہاں پہنچ جائیں۔"

میں بھاگم بھاگ گورنر جنرل ہاؤس پہنچا اور سیدھا مسٹر غلام محمد کے بیڈ روم میں گیا' جو تیز روشنیوں سے بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ گورنر جنرل اپنے بستر پر بہت سے تکیوں کا سہارا لیے بیٹھے تھے اور ان کے اسٹاف کے کئی ممبر کمرے میں ادھر ادھر سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو مسٹر غلام محمد کچھ دیر تک اپنی پیلی پیلی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑے مجھے گھورتے رہے۔ پھر بڑے تلخ انداز میں بولے۔ "مجھے زندہ دیکھ کر آپ کو بڑی مایوسی ہو گی۔ آپ تو بڑے شوق سے میرا جنازہ اٹھانے آ رہے تھے۔"

میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی' تو انہوں نے ڈانٹ کر مجھے چپ کرا دیا اور کہنے لگے۔

"جب تم ٹیلیفون پر فرخ امین سے بات کر رہے تھے' تو میں بھی ریسیور سے کان لگا کر سن رہا تھا۔ تم نے بڑے شوق سے پوچھا تھا کہ کیا یہ بڈھا مر گیا ہے؟"

میں اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہتا تھا لیکن وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ دو ڈھائی گھنٹے تک انہوں نے اسی ایک بات کو طول دے کر بار بار ایسی رٹ لگائی کہ آخر بالکل نڈھال ہو کر تکیوں پر گر گئے۔ ہم نے ان کے ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے آ کر انہیں کچھ گولیاں کھلائیں اور ٹیکہ لگا کر سلا دیا۔

For more books visit www.4Urdu.com

بعد میں معلوم ہوا کہ مسٹر غلام محمد یہ کچہری رات کے دس بجے سے لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے ذاتی عملے کے کسی ملازم سے کوئی قصور سرزد ہو گیا تھا۔ دس بجے سے اس پر مقدمہ چل رہا تھا اور سزا تجویز ہو رہی تھی۔ آخر تنگ آ کر آدھی رات کے قریب کسی نے یہ تجویز پیش کی کہ یہ سارا کیس سیکرٹری صاحب کے سپرد کر دیا جائے' وہ پوری انکوائری کر کے اپنی رپورٹ گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کریں۔ اس مقصد کے لیے مجھے بلایا گیا اور جب میں حاضر ہوا تو اصل مقدمہ خارج ہو گیا اور ایک بالکل نیا بکھیڑا کھڑا ہو گیا۔ اس زمانے میں مسٹر غلام محمد کا ذہن اسی طور پر کام کرتا تھا۔

ایک روز دفتر پہنچتے ہی پیغام ملا کہ گورنر جنرل یاد فرما رہے ہیں۔ میں ان کے بیڈ روم میں داخل ہوا تو فرش پر ایک فائل پڑی ہوئی نظر آئی۔ میں نے سوچا کسی سے بے خیالی میں گر گئی ہو گی۔ میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ گورنر جنرل نے اپنا ٹائم پیس تڑاخ سے میرے سر پر دے مارا اور گرج کر کہا۔ "فائل کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ ٹائم پیس اٹھا کر یہاں لاؤ۔" میں نے ٹائم پیس اٹھا کر انہیں واپس دیا تو انہوں نے ٹٹول ٹٹول کر اس کا بغور جائزہ لیا کہ میرے سر سے ٹکرا کر اس کا کچھ بگڑ تو نہیں گیا۔ میرے سر میں اس کی ضرب سے گھمڑ سا پڑ گیا تھا۔ میں نے کسی قدر طنز سے کہا۔ "یہ ٹائم پیس بڑا نازک اور قیمتی ہے۔ اس سے پتھر کا کام لینا جائز نہیں۔"

"تمہارا سر بھی تو کنکریٹ سے بنا ہوا ہے۔" مسٹر غلام محمد نے مسکرا کر کہا۔

خیر سگالی کی اس گفتگو کے بعد انہوں نے مجھے مسہری پر بٹھا لیا اور فرش پر پڑی ہوئی فائل کا قصہ سنایا۔ بات یہ ہوئی کہ کل رات انہوں نے مس بورل کو ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ وہ حسب معمول اپنی بوڑھی والدہ کو اپنے ساتھ لے کر آئی۔ یہ بات مسٹر غلام محمد کو پسند نہ تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ مس بورل ڈنر پر تنہا آیا کرے۔ لیکن مس بورل اکثر ان کی اس آرزو کو پورا نہ کیا کرتی تھی۔ کل رات ڈنر کے دوران مسٹر غلام محمد نے مس بورل کی والدہ کے ساتھ بے رخی کا برتاؤ کیا اور کچھ نازیبا کلمات

For more books visit www.4Urdu.com

بھی کہے۔ مس بورل نے اس بات کا بہت برا منایا۔ آج صبح گورنر جنرل نے اسے ایک فائل کے ساتھ اپنے کمرے میں طلب کیا۔ وہ منہ پھلائے ہوئے آئی۔ مسٹر غلام محمد نے اسے حکم دیا کہ وہ صبح سویرے روتی صورت لے کر ان کے کمرے میں نہ آئے' بلکہ مسکراتی ہوئی ان سے ملے۔ مس بورل اسی طرح منہ پھلائے کھڑی رہی۔ گورنر جنرل نے تحکمانہ انداز میں کئی بار اسے مسکرانے کا حکم دیا تو اس نے غصے سے فائل زمین پر دے ماری اور روتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

اب مسٹر غلام محمد نے میرے ذمہ یہ ڈیوٹی سپرد کی کہ میں مس بورل کو سمجھا بجھا کر یہاں واپس لاؤں' وہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہو اور ہنسی خوشی فرش پر پڑی ہوئی فائل اٹھا کر گورنر جنرل کے حضور میں پیش کرے۔ میں مس بورل کے پاس گیا' تو وہ غالباً اسی نوعیت کی طلبی کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ وہ بڑی زیرک اور غمگسار طبیعت کی لڑکی تھی اور مسٹر غلام محمد کی معذوریوں کی وجہ سے اسے ان کے ساتھ ایک خاص قسم کی ہمدردی تھی۔ میں نے اسے ٹائم پیس سمیت سارا واقعہ سنایا' تو وہ فوراً میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی۔ گورنر جنرل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنی مسکراہٹوں کا فوارہ چھوڑا اور فرش پر پڑی ہوئی فائل اٹھا کر اسے بصد ادب و احترام ان کی خدمت میں پیش کیا۔ مسٹر غلام محمد کا چہرہ دودھ پیتے بچے کی طرح کھل اٹھا اور ان کے منہ کے دونوں کونوں سے بے اختیار رالیں ٹپکنے لگیں۔ پھر اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور غرا کر بولے۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں یہاں کس نے بلایا ہے؟ فوراً میری نظروں سے دور ہو جاؤ....."

مسٹر غلام محمد نے کبھی یہ بات تسلیم نہ کی تھی کہ فالج کی وجہ سے ان کی زبان میں شدید لکنت ہے اور لوگ ان کی بات سمجھنے سے قاصر ہیں۔ غالباً وہ اسی خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ ان کی باتوں کا معیار اتنا بلند ہوتا ہے کہ کم فہم لوگ انہیں آسانی سے سمجھ نہیں پاتے یا کبھی کبھی وہ سمجھتے تھے کہ دوسرے لوگوں کو سماعت میں کوئی فتور

For more books visit www.4Urdu.com

ہے۔ ایک روز ایک جائنٹ سیکرٹری اپنے وزیر کے ہمراہ گورنر جنرل کے پاس آیا ہوا تھا۔ اس بیچارے کی سمجھ میں گورنر جنرل کی کوئی بات نہ آ رہی تھی۔ تنگ آ کر مسٹر غلام محمد نے پوچھا' "کیا تم بہرے ہو؟"

URDU4U.COM

جان بچانے کی خاطر جائنٹ سیکرٹری نے بہانہ بنایا۔ "جی ہاں' سر۔ آجکل میرے کانوں میں بڑی تکلیف ہے۔"

اب کیا تھا۔ گورنر جنرل نے ڈسپنسری سے کمپاؤنڈر کو بلوایا اور وہیں بیٹھے بیٹھے بچارے جائنٹ سیکرٹری کے کانوں میں پچکاری لگوا کر صفائی کر دی!

ایک بار عید کے موقعہ پر مسٹر غلام محمد کے سر پر یہ بھوت سوار ہو گیا کہ وہ قوم کے نام اپنا پیغام خود براڈ کاسٹ کریں گے۔ ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل زیڈ۔ اے۔ بخاری کو یہ ترکیب سوجھی کہ پیغام ریکارڈ کر کے پہلے گورنر جنرل کو سنا دیا جائے۔ وہ عقل مند آدمی ہیں۔ یہ اشارہ خود سمجھ جائیں گے کہ ان کی آواز اس قابل نہیں ہے کہ ریڈیو پر براڈ کاسٹ کی جائے۔ چنانچہ بخاری صاحب کی سرکردگی میں بڑے اہتمام سے مسٹر غلام محمد کی تقریر ریکارڈ کی گئی۔ اس کے بعد بخاری صاحب نے بڑے ادب سے پوچھا۔ "حضور' کیا آپ اپنی تقریر کا ریکارڈ سننا پسند فرمائیں گے؟"

"ضرور۔" گورنر جنرل نے گرمجوشی سے جواب دیا۔

اب جو ریکارڈنگ کا ٹیپ چلایا گیا' تو اس سے خر خر' غر غر' غاں غاں کے ساتھ لپٹی ہوئی ایسی آوازیں برآمد ہونے لگیں جیسے پھٹے ہوئے پائپ سے بہت سی گیس بہ یک وقت خارج ہونے کی کوشش کر رہی ہو۔ آدھا ٹیپ سن کر مسٹر غلام محمد آپے سے باہر ہو گئے اور انہوں نے بخاری صاحب کا ٹیٹوا لیا کہ ریڈیو کا یہ کیسا اناڑی ڈائریکٹر جنرل ہے جو ایک تقریر بھی صحیح طور پر ریکارڈ نہیں کر سکتا؟ اس روز ہم لوگوں نے بڑی مشکل سے بخاری صاحب کو گورنر جنرل ہاؤس سے صحیح سلامت باہر نکالا اور مسٹر غلام محمد کافی عرصہ تک اپنے ملنے والوں سے ان کی نااہلی اور اناڑی پن کا رونا روتے رہے۔

For more books visit www.4Urdu.com

کابینہ کے وزیر' غیر ملکی سفیر اور دوسرے ملاقاتی جب گورنر جنرل سے ملنے آتے تھے تو انہیں مسٹر غلام محمد کی گفتگو سمجھنے میں بڑی دشواری پیش آتی تھی۔ ایسے موقعوں پر کوئی اے۔ ڈی۔ سی یا مس بورل یا میں موقع پر موجود ہو کر ترجمانی کے فرائض ادا کیا کرتے تھے۔ ایک بار مصر کے صدر جمال عبدالناصر کسی دورے پر جاتے ہوئے ایک رات کے لیے کراچی میں رکے۔ انہیں گورنر جنرل ہاؤس میں مہمان ٹھہرایا گیا۔ رات کو ان کے اعزاز میں عشائیہ تھا۔ ڈنر سے پہلے دونوں صاحبان کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے سے ملے تو ان کے درمیان انگریزی میں گفتگو ہونے لگی۔ بات چیت کا آغاز اس طرح ہوا:

مسٹر غلام محمد: پچھلے سال میں بڑا شدید بیمار ہو گیا تھا۔

صدر ناصر: (کچھ نہ سمجھے۔ بلکہ یہ قیاس کیا کہ رسم کے مطابق وہ ان کی خیریت دریافت کر رہے ہیں) یس' ایکسیلنسی۔ گڈ۔ ویری گڈ۔

مسٹر غلام محمد: میں اتنا سخت بیمار ہو گیا تھا کہ مرنے کے قریب تھا۔

صدر ناصر: یس' ایکسیلنسی۔ گڈ۔ ویری گڈ!

اس مرحلے پر ہمارے عملے کا ایک آدمی وہاں پہنچ گیا اور اس نے ترجمانی کا فریضہ سنبھال کر صورت حال کو مزید پیچیدگی سے بچا لیا۔

اسی زمانے میں ترکی کے صدر جلال بیار نے بھی پاکستان کا دورہ کیا تھا۔ وہ انگریزی بالکل نہ سمجھتے تھے اور ان کا ذاتی ترجمان ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا تھا۔ گورنر جنرل کے سرکاری ڈنر کے دوران ترجمان دونوں کے پیچھے کرسی پر بیٹھ گیا تاکہ مسٹر غلام محمد کی گفتگو کا ترجمہ ترکی میں اور جلال بیار کی باتوں کا ترجمہ انگریزی میں کرتا جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پسینہ پسینہ ہو گیا اور سر پکڑ کر وہاں سے غائب ہو گیا کیونکہ مسٹر غلام محمد کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ کیا میں اس کی کچھ مدد کروں؟ اس نے جواب دیا' کہ صدر جلال بیار نے کہا ہے کہ وہ ترجمان کے بغیر ہی صورت حال سے بخوبی نپٹ لیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد کھانے

For more books visit www.4Urdu.com

کے دوران مسٹر غلام محمد مسلسل بولتے رہے اور ترکی کے صدر کبھی مسکرا کر' کبھی سر ہلا کر' کبھی آنکھیں گھما کر ان باتوں کا جواب اشاروں ہی اشاروں میں دیتے رہے۔ کھانے کی میز پر دو سربراہان مملکت کے درمیان اس قدر طویل یکطرفہ مکالمہ اور کہیں نہیں ہوا ہو گا۔

ایک روز کراچی کے چند مشہور و معروف شہریوں کی درخواست موصول ہوئی کہ اہالیان شہر کے نمائندوں کا ایک وفد گورنر جنرل ہاؤس میں ایک تقریب منعقد کر کے مسٹر غلام محمد کی خدمت میں "محافظ قوم" "Saviour of the Nation" کا خطاب پیش کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس پر ایک لمبا چوڑا نوٹ لکھا کہ یہ لوگ خوشامدی ٹٹو ہیں۔ چڑھتے سورج کی پوجا کرنا ان کا شیوہ ہے۔ ایسی تقریبات سے ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ ارباب حکومت کا قرب حاصل کر کے اپنا الو سیدھا کریں۔ یہ لوگ اپنی ذات کے سوا اور کسی کی نمائندگی نہیں کرتے اور ان کی طرف سے گورنر جنرل کو قومی خطاب دیا جانا بڑی مضحکہ خیز بات ہے۔ لہٰذا میں نے مشورہ دیا کہ اس درخواست کو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے رد کر دیا جائے۔

میرا نوٹ پڑھ کر مسٹر غلام محمد سیخ پا ہو گئے۔ انہوں نے میرا نوٹ تو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے کہ ساری قوم تو قدر شناسی کے طور پر ان کے سر پر عظمت کا تاج رکھنا چاہتی ہے اور میں اس منصوبہ کو سبوتاژ کرنے کے لیے بے قرار ہوں۔ انہوں نے حکم دیا کہ اس معاملے کے ساتھ مزید کوئی سروکار نہ رکھوں اور اس خط کا جواب انہوں نے میرے ڈپٹی سیکرٹری سے تحریر کروایا کہ وہ لوگ بڑی خوشی سے تشریف لائیں اور قوم کی جانب سے (Saviour of the Nation) کا خطاب مسٹر غلام محمد کو مرحمت فرمائیں۔ گورنر جنرل اس اعزاز کو قبول فرمانے کے لیے بخوشی تیار ہیں۔

اس مقصد کے لیے جو تقریب منعقد ہوئی وہ اسی نوعیت کی تھی جیسے چھوٹے چھوٹے بچے جھوٹ موٹ مل کر گڑیا گڑیے کی شادی رچاتے ہیں۔ ایک کشادہ برآمدے میں قالین

For more books visit www.4Urdu.com

بچھائے گئے ان پر کرسیاں اور صوفے لگائے گئے۔ کراچی کے پچیس تیس جغادری خوشامدی ان پر ادب سے بیٹھ گئے۔ مسٹر غلام محمد کالی شیروانی اور جناح کیپ پہنے ایک کمرے سے نمودار ہوئے اور عاجزی سے مسکین صورت بنا کر ایک کرسی پر براجمان ہو گئے۔

URDU4U.COM

ایک صاحب نے سنہری چوکھٹے میں فریم کیا ہوا کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا توصیفی ایڈریس پڑھا اور مبالغے کے جملہ اصناف کو کام میں لا کر مسٹر غلام محمد کو پاکستانی قوم کا نجات دہندہ ثابت کیا۔ جواب میں گورنر جنرل نے جذبات سے مغلوب ہو کر کچھ ٹسوے بہائے اور بھرائی ہوئی آواز میں اپنے اس عزم کا اعلان کیا کہ وہ زندگی کے آخری سانس تک اپنے عزیز وطن اور قوم کی اسی طرح بے لوث خدمت سرانجام دیتے رہیں گے۔ حاضرین نے تالیاں بجائیں اور نجات دہندہ قوم۔۔ زندہ باد" کے نعرے لگائے۔ اس کے بعد سب نے چائے کے ساتھ کیک' پیسٹری اور سموسے کھائے اور اس ضروری کارروائی کے بعد وہ محفل برخاست ہو گئی جس میں جھوٹ' چاپلوسی اور خوشامد کی ملمع سازی اتنی نمایاں تھی کہ اسے دیکھ کر گھن آتی تھی اور کراہت محسوس ہوتی تھی۔

اگر خوشامدیوں کی صحبت میسر آنا خوش قسمتی ہے تو اس باب میں مسٹر غلام محمد واقعی خوش قسمت تھے۔ ان کے قریب ترین اور عزیز ترین دوستوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو گورنر جنرل کے زمانے میں ان کے کھلے بندوں شرمناک حد تک خوشامد نہ کرتا ہو۔ ایک بار وہ اپنے دو تین دوستوں کو ساتھ لے کر کار میں ہوا خوری کے لیے نکلے۔ مجھے بھی اگلی سیٹ پر ساتھ بٹھا لیا۔ ان دنوں کراچی میں غالباً پہلی آٹھ دس منزلہ عمارت "قمر ہاؤس" کے نام سے تعمیر ہو رہی تھی۔ جب ہم اس کے قریب سے گزرے تو مسٹر غلام محمد نے پوچھا' کہ اتنی بڑی بلڈنگ کون بنوا رہا ہے؟ ان کے ایک دوست نے فوراً ادب سے سر جھکا کر کہا۔ "حضور کے اقبال سے بن رہی ہے۔" ایک مسجد سے کچھ لوگ مغرب کی نماز پڑھ کر باہر نکل رہے تھے۔ دوسرے دوست نے گورنر جنرل کی توجہ ان کی طرف منعطف کروائی اور کہا۔ حضور کے اقبال سے آجکل مسجدیں خوب آباد ہیں اتنے نمازی پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئے۔ سب آپ کی برکت ہے۔" "اس